وفاگزیدہ



ناول رزاق شاہد کوہلر

وفا گزیدہ

منظر دل کو موہ لینے والا تھا۔ چاروں طرف پھل دار درخت تھے جن پر ہمہ قسم کے پھل موجود تھے۔ وہاں پھولوں کی بہتات تھی۔ سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا مگر اُس کی تمازت میں چاند کی روشنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی، ہوا کی اِس سرسراہٹ میں ایک نغمگی تھی جو سماعتوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ یہ ایک نہایت ہی خوب صورت وادی تھی، اتنی حسین وجمیل کہ لگتا تھا جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا اُٹھا کر زمین پر رکھ دیا گیا ہو۔ وہاں ایک شفاف پانی کا چشمہ بھی رواں تھا۔ اُس چشمے کا پانی اِس قدر صاف وشفاف تھا کہ اُس کی تہہ میں سُنہری ریت اور رنگ برنگے پتھروں کے ٹکڑے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خوش آواز پرندے پھل دار درختوں پر چہک رہے تھے جب کہ قسم قسم کی رنگین تتلیاں پھولوں پر منڈلا رہی تھیں۔ اِس قدر حسین پرندے اور رنگین تتلیاں وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ سارا منظر اُس کے لیے نیا تھا، بلکہ نیا کیا اُس کے تصور سے بھی ماورا تھا۔ پھل دار درختوں پر ایسے ایسے پھل بھی موجود تھے جو اِس سے قبل اُس کی آنکھ نے نہیں دیکھے تھے۔ اُسے اِن پھلوں کے نام تک نہیں آتے تھے۔ اِسی طرح وہ رنگین اور نرم ونازک تتلیاں بھی اُس کی نگاہوں کے لیے اجنبی تھیں اور وہ اِدھر اُدھر اُڑتے پھدکتے پرندوں کو بھی کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

وہ سحر زدہ سا چشمے کے کنارے کھڑا ہوا تھا کہ ایسے ہی وقت چشمے کے دوسرے کنارے پر موجود پھولوں کی اوٹ سے ایک نہایت ہی خُوب رو اور پری پیکر عورت نمودار ہوئی جو سر تا پا سفید ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔ وہ کچھ اِس انداز میں چل رہی ہوتی ہے جیسے ہوا میں تیر رہی ہو، بظاہر وہ بڑے پُر وقار انداز میں قدم اُٹھاتی ہے مگر اُس کے پاؤں زمین کو چُھوتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ جو پہلے ہی فطرت کے حسین مناظر دیکھ کر سحر زدہ سا تھا، یہ منظر دیکھ کر پتھر بُت بن کر رہ گیا۔ عورت چشمے کے کنارے پہنچ کر عین اُس کے سامنے رُک جاتی ہے۔ تب وہ جیسے ہوش میں آ کر غور سے اُس پری پیکر کو دیکھتا ہے۔ عورت کے حسین و جمیل چہرے پر رنج و ملال کے آثار ہوتے ہیں۔ جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بے بسی جھلک رہی ہوتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔ عورت کے آنسو دیکھ کر اُس کا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ وہ اُسے تسلی دینے کے لیے لب کشائی کرتا ہے مگر اُس کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ اپنی پوری توانائی صَرف کرنے کے باوجود وہ بول نہیں پاتا۔ تب اُس پر ایک بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اُس کے اندر ایک طوفان برپا ہوتا ہے لیکن لب گویائی سے محروم ہوتے ہیں۔

عورت اگرچہ اُس کی ہم عمر ہوتی ہے مگر وہ اُس کے حُسن سے قطعی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے دل میں عورت کے لیے بے حد و بے حساب احترام کے جذبات محسوس کرتا ہے۔ ایسے جذبات اِس سے قبل اُس نے کسی عورت کے لیے محسوس نہیں کیے تھے۔ وہ اِن جذبات کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

وہ عورت سے سوال کرنا چاہتا ہے، اُس سے اِس قدر ملول اور رنجیدہ ہونے کا سبب پوچھنا چاہتا ہے لیکن اُس کی قوتِ گویائی سلب ہوتی ہے۔ اپنی پوری کوشش کے بوجود وہ ایک لفظ بھی نہیں بول پاتا۔ عورت کچھ دیر تک اُس کے سامنے ٹھہری رہتی ہے اور پھر جیسے آئی تھی ویسے ہی پلٹ جاتی ہے۔ جب وہ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو تب اُس کی گویائی بھی پلٹ آتی ہے۔ وہ چیخ کر عورت کو رکنے کے لیے کہتا ہے مگر اِس دوران تک وہ بہت دُور جا چکی ہوتی ہے۔ اُس کی آواز شاید عورت کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پاتی مگر وہ مسلسل اُسے پکارتا چلا جاتا ہے۔ ایک طرح سے اُس پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پوری قوت سے چیخنے اور چلانے لگتا ہے لیکن وہاں اُس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ نڈھال ہو کر وہ رونے لگتا ہے، یہاں تک کہ روتے روتے اُس کی ہچکی

بندھ جاتی ہے اور بدن لرزنے لگتا ہے۔

☆......☆......☆

''علی......علی.....اُٹھو.....یہ کیا بے ہودگی ہے.....نیند میں کسے پکار رہے ہو؟'' معاً اُس کی سماعتوں سے ایک شناسا نسوانی آواز ٹکراتی ہے اور پھر ایک ہاتھ اُسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا ہے۔

''وہ.......وہ......کہاں گئی؟'' وہ ایک دم اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کرتا ہے۔

''کون کہاں گئی بھئی؟'' اُس کی بیوی میمونہ نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیا تم نے پھر وہی خواب دیکھا ہے؟''

''مم.....میں نے اُسے سچ مچ دیکھا ہے.......لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جب وہ میرے پاس آتی ہے تو اُس وقت میری قوت گویائی کیوں سلب ہو جاتی ہے؟'' اُس نے پریشان کن انداز میں سوال کیا۔

''ہوش میں آؤ جناب عزت مآب علی صاحب! اِس وقت تم اپنے بیڈروم میں ہو......پھر تم نے اُسے سچ مچ کیسے دیکھ لیا؟'' میمونہ کے انداز میں جھنجھلاہٹ اور جیلسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ عورت تھی اور اپنے شوہر کو کسی غیر عورت کے لیے پریشان اور فکر مند نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''ہاں.....شاید میں نے اُسے خواب ہی میں دیکھا ہے.....مگر......مگر وہ مجھ سے بولتی کیوں نہیں؟ اُس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

میمونہ نے جل کر کہا۔ ''تمہیں اُس کے نہ بولنے کی پریشانی کیوں ہے؟.....مجھ سے بولو ناں! میں مر تو نہیں گئی؟''

''بکواس مت کرو جاہل عورت۔'' وہ ایک دم بگڑ گیا۔

''ٹھیک کہتے ہو جناب۔'' میمونہ روہانسی ہو گئی۔ ''وہ خوابوں والی یقیناً مجھ سے زیادہ خوب صورت ہو گی ورنہ تم اُس کے لیے یوں پریشان نہ ہوتے؟''

''تم پڑھی لکھی جاہل ہو.......وہ خواب ہے حقیقت نہیں ہے اور پھر میں اُس کے لیے ایسے ویسے جذبات بھی محسوس نہیں کرتا۔'' علی نے اپنی صفائی پیش کی۔ ''تم منفی انداز میں کیوں سوچتی ہو.......مثبت سوچا کرو۔''

''میں مثبت سوچتی رہوں اور تم اُس ڈائن کے خواب دیکھتے رہو......نہ جانے کون منحوس ہے؟''

علی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، اُس کا جی چاہا کہ وہ میمونہ کے چہرے کو تھپڑوں سے لال کر دے لیکن وہ غصہ پی گیا۔ اگر وہ ایسا کوئی قدم اُٹھاتا تو سب اُس پر ہنستے اور اُس کا مذاق اُڑاتے۔ یہ بات اُسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔ وہ اپنا اور میمونہ کا تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اب وہ میمونہ کو غصے سے گھور رہا تھا۔

میمونہ نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ پر غصہ آرہا ہے لیکن میں کسی صورت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ میرا شوہر کسی غیر عورت کے خواب دیکھتا رہے۔''

''تعلیم یافتہ ہو کر جاہلوں والی باتیں مت کرو......خواب کوئی اپنی مرضی سے نہیں دیکھتا۔ میں تو خود تنگ ہوں اِن خوابوں سے......مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے اِن خوابوں نے۔''

''خوابوں نے یا خوابوں والی نے؟'' اُس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''یہ دیکھ....'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پریشان نہ کرو میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں......خدا کے لیے چلی جاؤ یہاں سے، مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو.........پلیز.........پلیز.......''

''اوکے۔'' وہ ناراض انداز میں دروازے کی طرف بڑھی مگر پھر پلٹ کر بولی۔ ''ناشتا لاؤں کیا؟''

''ابھی نہیں تھوڑی دیر کے بعد لانا۔''

''آفس کی دیر ہو جائے گی، آٹھ تو بج چکے ہیں۔''

''میں آج آفس نہیں جاؤں گا۔'' اُس نے جواب دیا اور میمونہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

گرین کلر کی وہ فوجی جیپ مانسہرہ سے آگے گلگت جانے والی سڑک پر تیزی سے رواں دواں تھی۔ جیپ میں دو نوجوان سوار تھے لیکن اُن دونوں کا تعلق آرمی سے نہیں تھا۔ وہ دونوں نئے نئے یونی ورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور اب شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے جا رہے تھے۔ ڈرائیونگ کرنے والے نوجوان کا نام شہزاد علی تھا اور اُس کے ساتھی کا نام جمال احمد تھا۔ جیپ شہزاد کی ملکیت تھی، جو دو سال قبل اُس کے باپ نے آرمی کی نیلامی میں سے بڑے سستے داموں خریدی تھی۔ جیپ بے شک پُرانی تھی مگر بہت اچھی حالت میں تھی۔ طاقت ور انجن والی یہ جیپ پہاڑی سفر کے لیے نہایت ہی موزوں تھی۔ ایک عام کار کے مقابلے میں وہ بدرجہا بہتر

تھی۔اُس کی سیٹیں کشادہ تھیں اور چھت بھی باآسانی اُتاری اور لگائی جاسکتی تھی۔
وہ دونوں وسطی پنجاب کے ایک مشہور و معروف ضلع کے رہنے والے تھے۔شہزاد کا تعلق ایک دیہاتی جاگیر دار گھرانے سے تھا اور اُس کا والد ایک روایتی جاگیر دار تھا جب کہ جمال شہر کا رہنے والا تھا اور اُس کا باپ یونی ورسٹی میں پروفیسر تھا۔دونوں کی دوستی کالج کے زمانے سے شروع ہوئی تھی جواب تک قائم چلی آرہی تھی۔شہزاد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا تاہم جمال کے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔بہن اُس سے چھوٹی تھی اور ابھی کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔دونوں بھائی اُس سے بڑے تھے، دونوں ہی برسرِ روزگار اور شادی شدہ تھے۔مانسہرہ سے نکلے اُنھیں کافی دیر گزر چکی تھی اور اب بھوک نے اُنھیں ستانا شروع کر دیا تھا۔شہزاد گاڑی چلاتے ہوئے کسی مناسب ہوٹل کی تلاش میں تھا، جو ابھی تک اُسے نظر نہیں آیا تھا۔چند ایک ہوٹل اُس نے جان بوجھ کر چھوڑ دیے تھے۔یہ صورتِ حال جمال کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔وہ ویسے بھی بہت بے صبرا تھا جب کہ یہاں تو معاملہ بھی پیٹ کا تھا۔چنانچہ شہزاد نے جب پانچواں ہوٹل نظر انداز کیا تو جمال سے صبر نہ ہوسکا۔
”خدا کے لیے یار خود پر نہ سہی مجھ پر ہی رحم کرلو.....میں بھوک سے مرا جارہا ہوں.....اب تو پیٹ میں چوہوں کی جگہ باگڑ بلے دوڑنے لگے ہیں۔“ وہ فریادی انداز میں بولا۔”پلیز.....اب جیسا بھی ہوٹل نظر آئے گاڑی روک دینا ورنہ میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں گا۔“
شہزاد نے کہا۔”بے صبرے مت بنو آگے ایک اچھا ہوٹل آنے والا ہے۔وہاں کا کھانا اچھا خاصا لذیذ ہوتا ہے ورنہ یہاں کے لوگ تو گوروں کی طرح بالکل بے لذت و پھیکا کھانا کھاتے ہیں۔مجھے سمجھ نہیں آتی یہ لوگ مرچ مسالوں سے اتنا الرجک کیوں ہیں؟“
”گورا بننے کے لیے یار.....یہ لوگ ہم پنجابیوں کی طرح مرچ مسالے کھا کر اپنا رنگ وروپ نہیں بگاڑتے۔ اب تم میری شکل ہی دیکھ لو تو بے سے تھوڑی ہی کم کالی ہوگی۔“ جمال نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔
”لعنت ہے تیری شکل اور عقل پہ.....احمق انسان! رنگت کا تعلق کھانے پینے سے تھوڑی ہوتا ہے؟“
”تو اور کس پہ ہوتا ہے؟“
”آب و ہوا اور موسمیاتی تغیر پر ہوتا ہے، اب تم بھی اِن بلتستانیوں کی طرح گورے چٹے ہو جاؤ گے۔“

”کون بلتستانی؟“ جمال نے تحیر آمیز انداز میں پوچھا۔
”اسکردو اور گلگت کے رہنے والوں کو بلتستانی بولتے ہیں جیسے ہمیں........“
”او...یس جیسے ہمیں پاکستانی بولتے ہیں۔“ جمال نے قطع کلامی کی۔”ایم آئی رائیٹ؟“
”سو بار لعنت تیری عقل پہ.....گدھے بلتستانی بھی پاکستانی ہی ہیں اور.......“
”پاکستانی ہیں تو پھر انھیں بلتستانی کیوں بولتے ہیں؟“ جمال نے دوبارہ قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔
”ہمیں پنجابی کیوں بولتے ہیں؟“ شہزاد نے اُلٹا سوال داغا۔
”ویری سمپل.....کیوں کہ ہم پنجابی بولتے ہیں۔“
”تم گدھے ہو اور گدھے ہی رہو گے.....تمہیں سمجھانا اور ابلیس کو کلمہ پڑھانا ایک برابر ہے۔“
”ذرہ نوازی ہے جناب کی ورنہ یہ ناچیز کس قابل ہے؟“ وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔
”تم سے بکواس میں جیتنا ناممکن ہے۔“ شہزاد نے نفی میں سر ہلایا۔”تم نے ماسٹرز کر رکھی ہے اس سبجیکٹ میں۔“
”تمہیں شک ہے کیا؟“
”میں تو کیا تیری اس ڈگری کو سپریم کورٹ بھی چیلنج نہیں کر سکتی۔“ اُس نے ہنس کر جواب دیا۔
”ڈگری اصلی ہے بیٹے!“ جمال نے قہقہہ لگایا۔”سیاست دانوں والی تو نہیں.....کون مائی کا لعل اسے جعلی قرار دے سکتا ہے؟“
اسی دوران شہزاد کی نظر مطلوبہ ریسٹورنٹ پر پڑی، جو دائیں ہاتھ سڑک سے تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر واقع تھا۔اُس نے گاڑی کا اسٹیرنگ گھمایا اور گاڑی سیدھی جا کر ریسٹورنٹ کے وسیع احاطے میں رُک گئی۔وہاں پہلے سے ایک مسافر بردار بس بھی موجود تھی، جس کی سواریاں کھانے اور چائے پینے میں مصروف تھیں۔ریسٹورنٹ کے کشادہ احاطے میں کھرے بان کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ہر دو چارپائیوں کے درمیان لکڑی کا ایک ٹیبل موجود تھا۔ویٹر بھاگ بھاگ کر مسافروں کو کھانا اور چائے سرو کر رہے تھے۔
وی آئی پی مسافروں کے لیے وہاں ایک خوب صورت ہال بھی موجود تھا۔وہ دونوں بس کے مسافروں

کو دیکھتے ہوئے ریسٹورنٹ کے ہال میں داخل ہو گئے۔ہال بالکل خالی پڑا ہوا تھا،نگران کے بیٹھتے ہی ایک ویٹر الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح ایک سیکنڈ میں حاضر ہو گیا۔

''حکم کیجیے صاب! کیا پیش کروں؟'' ویٹر نے کاروباری انداز میں پوچھا۔

شہزاد بولا۔''مینیو تو پیش کرو......ایسے کیسے آرڈر کریں؟''

''آپ کو تو پتا ہے صاب کہ یہاں کارڈ والا نہیں زبانی مینیو چلتا ہے۔'' ویٹر نے دانت نکالے۔

شہزاد نے کہا۔''او کے.....شروع ہو جاؤ۔''

''بھنڈی سادہ، کریلا گوشت، مرغ پلاؤ، آلو گوشت اور چنے کی دال۔'' ویٹر نے فر فر مینیو پیش کیا جو غالب کے مصرعے سے کچھ لمبا مگر بے وزن تھا۔

''بس۔'' جمال نے بُرا سا منہ بنایا۔

''چائے، پیسٹری بسکٹ اور کوک، پیپسی بھی ہے صاب۔'' ویٹر نے مینیو کا دوسرا مصرع عرض کیا۔

''کریلا گوشت، مرغ پلاؤ اور آلو گوشت ٹھیک رہے گا۔'' شہزاد نے آرڈر دیا۔

''ابھی لایا صاب۔'' ویٹر تیزی سے باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ کے بعد ویٹر نے اُنھیں کھانا سرو کر دیا تھا۔جمال بھوکے گدھ کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا تاہم شہزاد آرام کے ساتھ کھا رہا تھا۔ پانچویں تندوری روٹی کا آخری نوالہ اندر ٹھونستے ہوئے جمال نے ایک لمبی ڈکار لی اور بولا۔''ٹھیک کہا تھا تم نے، کھانا واقعی اچھا تھا۔زندگی میں پہلی بار میں نے تین روٹیاں اکٹھی کھائی ہیں۔''

''تین نہیں پانچ، تمہاری گنتی کمزور ہے۔'' شہزاد نے جواب دیا۔

''خدا کا خوف کرو یار!'' اُس نے احتجاج کیا۔''میں آدمی ہوں، کوئی گھوڑا خچر نہیں ہوں۔''

''کئی آدمیوں کے ساتھ گھوڑے اور خچر کا پیٹ لگا ہوتا ہے۔تم بھی اُنہی میں سے ایک ہو۔''

پھر اس سے قبل کہ جمال اُسے کوئی کرارا سا جواب دیتا باہر سے لڑنے جھگڑنے کی بلند آوازیں آنے لگیں اور وہ دونوں تیزی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”تم باہر جا کر دیکھو، میں بل ادا کر کے آتا ہوں۔“ شہزاد نے کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور جمال سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

خوابوں نے محاورتاً نہیں حقیقتاً علی کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ یہ خواب مہینے میں ایک دو بار ہی دیکھتا تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ اِن خوابوں میں تواتر آنے لگا تو اُس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ اب تو اُسے خواب میں نظر آنے والی عورت پر غصہ آنے لگا تھا مگر وہ بے بس تھا۔ اُس عورت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ خوابوں کو بھی نہیں روک سکتا تھا۔ اُسے کئی بار میمونہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ میمونہ اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور اُس کی پریشانی کو سمجھتی تھی لیکن خواب میں اُس کا کسی غیر عورت کو پکارنا اور پھر رونا میمونہ کو سخت ناپسند تھا۔ یہ اُس کی نسوانیت کی توہین تھی جو اُسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔ وہ گاہے گاہے اُس سے جھگڑنے لگی اور علی دن بدن چڑچڑا ہوتا چلا گیا حالانکہ اُن دونوں کی شادی ایک طوفانی محبت کا نتیجہ تھی لیکن اب اُن دونوں کے بیچ ایک دراڑ پڑنے لگی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دُور ہونے لگے تھے۔ چار سال قبل ہی تو اُن کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ بڑی مشکلوں کے ساتھ اور اپنے بزرگوں سے لڑ جھگڑ کر اُنھوں نے ایک دوسرے کو پایا تھا مگر اب اُن کی یہ جنونی محبت ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ البتہ اُس جنونی محبت کی نشانی فیضان علی کی صورت میں اُن کے پاس موجود تھی۔

اُن کے روز روز کے جھگڑوں سے ننھا فیضان بھی متاثر ہو رہا تھا لیکن اس طرف اُن کا دھیان ہی نہیں جا رہا تھا۔ فیضان ابھی بمشکل تین سال کا ہی تھا۔ ابھی تو وہ اچھی طرح بول بھی نہیں سکتا تھا، تاہم جب وہ دونوں ایک دوسرے پر چلاتے تھے تو فیضان رونے لگتا تھا۔ ”پاپا پاپا.... ممی ممی“ پکارتا رہتا تھا لیکن اُس معصوم کی پکار اُن دونوں کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ دو بار میمونہ روٹھ کر اپنے میکے گھر بھی جا چکی تھی۔ ہر بار اُسے علی ہی منا کر لایا تھا، اِس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ وہ جھگڑا نہیں کرے گا مگر علی کے خواب دوبارہ اُنھیں لڑنے کے مواقع فراہم کر دیتے تھے۔ یہ خواب نہیں تھے بلکہ عذاب تھے جنھوں نے اُس کی ہنستی بستی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

وہ سنڈے کا دن تھا، چونکہ اُس روز آفس نہیں جانا پڑتا تھا۔ اِس لیے علی دیر گئے تک سویا رہتا تھا۔ میمونہ بھی

جان بوجھ کر اُسے نہیں جگاتی تھی۔ اِس کی وجہ ایک تو اُن کے تعلقات کی ناچاقی تھی اور دوسری وجہ علی کے خواب تھے، جو وہ اب تقریباً بلاناغہ دیکھنے لگا تھا۔ اُس روز میمونہ نہ جانے کیا سوچ کر اُسے اُٹھانے کے لیے بیڈروم میں داخل ہوئی تو علی حسبِ معمول روتی ہوئی آواز میں اُسی خوابوں والی عورت کو پکار رہا تھا۔ ''سنو..... پلیز رُک جاؤ...... میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں...... خدا کے لیے ...... مجھے بتا دو.... تم کون ہو....... کہاں سے آتی ہو..... پلیز رُک جاؤ..... پلیز رُک جاؤ...... پلیز رُک جاؤ.......'' آہستہ آہستہ علی کی آواز سسکیوں میں ڈھل گئی اور بدن لرزنے لگا۔

یہ منظر میمونہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ پل بھر میں اُس کا خوب صورت چہرہ غصے کی شدت سے لال بھبھوکا ہو گیا اور آنکھیں جیسے انگارے برسانے لگیں۔ وہ بے قابو ہو کر آگے بڑھی اور علی کو بے دردی کے ساتھ جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''مم...... میں شاید.... پھر وہی خواب دیکھ رہا تھا۔'' وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔

''ہاں۔'' وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائی۔ ''تم اُسی کمینی کتیا کو کسی بھکاری کی طرح پکار رہے تھے لیکن اب میں یہ بے غیرتی مزید برداشت نہیں کروں گی..... بتاؤ مجھے وہ حرام زادی کون ہے؟ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''شٹ یور ماؤتھ۔'' وہ چلایا۔ ''میں تمہاری اس روز روز کی بکواس سے تنگ آ چکا ہوں۔ اب اگر تم نے اُس کے خلاف اپنی گندی زبان استعمال کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا..... بہت سُن چکا ہوں تمہاری بک بک۔''

''ایک بار نہیں سو بار کروں گی، تم کیا بگاڑ لو گے میرا؟'' وہ بھی چلائی۔ ''میں کسی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں ہوں۔ یہ دھونس کسی اور پر چلانا سمجھے تم..... میں اُسے کتیا تو کیا بازاری اور طوائف..........''

آخری الفاظ ابھی اُس کی زبان پر ہی تھے کہ علی ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھا، اُس نے میمونہ کے سر کے بال پکڑے اور پھر کمرا ''تڑاخ..... تڑاخ..... تڑاخ'' کی آواز سے گونج اُٹھا۔ میمونہ کے رخسار پر پڑنے والے یہ طمانچے بہت زوردار تھے۔ اُس کا دماغ جھنجھنا اُٹھا جب کہ اُس کے رخسار پر علی کی اُنگلیوں کے نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اُس کا محبوب شوہر اُس پر یوں بے دردی کے ساتھ ہاتھ

اُٹھائے گا۔ چند لمحے تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے علی کی طرف دیکھتی رہی پھر اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ وہ پلٹی اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہ سب کچھ اس قدر سرعت کے ساتھ وقوع پذیر ہوا تھا کہ علی سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ کوئی نادیدہ قوت تھی جس نے علی کو یہ انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ میمونہ پر ہاتھ اُٹھانے کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اُس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اُس کی ذراسی تکلیف بھی اُس سے برداشت نہیں ہوا کرتی تھی..... مگر آج اُس نے تھپڑ مار مار کر میمونہ کا چہرہ لال کر دیا تھا اور وہ بھی ایک انجان اور اَن دیکھی عورت کی خاطر جس کا شاید کوئی وجود ہی نہیں تھا، جو صرف ایک خواب ہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے احساسِ ندامت اُس پر غالب آ گیا۔ اُس نے اپنی دائیں ہتھیلی کو غور سے دیکھا اور پھر پاگلوں کی طرح کمرے کی پختہ دیوار پر مکّے برسانے لگا۔

''کیوں.....کیوں.....کیوں کیا میں نے ایسا؟'' مکّے برساتے ہوئے وہ ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا۔'' میں .....میں.....یہ ہاتھ ہی توڑ ڈالوں گا.......جو میمونہ پر اُٹھا تھا۔''

پختہ دیوار نے اُس کے ہاتھ کو لہولہان کر ڈالا تھا لیکن جب تک ہمت رہی وہ مکّے برساتا رہا۔ اِس کے بعد وہ نڈھال ہو کر وہیں گر گیا اور دبی دبی آواز میں رونے لگا۔



شہزاد جب کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے بعد باہر نکلا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مسافر بردار بس کا ڈرائیور اور کلینر ایک ادھیڑ عمر باریش شخص سے اُلجھے ہوئے تھے۔ باریش شخص کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی جو ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ لڑکی کا پورا بدن سوائے آنکھوں کے ایک سیاہ رنگ کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ شہزاد نے جمال سے صورتِ حال جاننے کے لیے استفسار کیا تو وہ بولا۔ ''دفع کر و یار، اِن کا کوئی کرایے کا معاملہ ہے۔''

''کیسا کرایے کا معاملہ؟'' شہزاد نے سوال کیا۔

''یہ شخص کہتا ہے کہ اس نے گلگت تک کا کرایہ ادا کر دیا ہے جب کہ بس کا عملہ اس بات سے انکاری ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس شخص کے پاس ٹکٹ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں ڈرائیور اور کلینر اس کی بات ماننے کے

لیے قطعی تیار نہیں ہیں۔'' جمال نے تفصیل بتائی۔

''ٹکٹ کھو بھی تو سکتا ہے یار۔''

''یہ شخص بھی یہی کہتا ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔

''سر! اگر آپ کا تعلق آرمی سے ہے تو پلیز اس بے بس شخص کی ہیلپ کریں۔'' اُن کے قریب موجود ایک نوجوان نے شہزاد سے استدعا کی۔

شہزاد بولا''ہیلپ تو تب کروں گا، جب مجھے سچ اور جھوٹ کا پتا چلے گا۔ کیا پتا اِس شخص نے واقعی کرایہ نہ دیا ہو؟''

''اس بات کا میں چشم دید گواہ ہوں سر۔'' نوجوان نے پُرجوش انداز میں کہا۔''اس نے میرے سامنے ٹکٹ کٹوایا تھا۔ یہ باپ بیٹی میرے آگے والی سیٹ پر تھے۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟'' شہزاد کا انداز مشکوک تھا۔

''سو فی صد سچ سر! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' نوجوان نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ وہ سچ مچ شہزاد کو آرمی آفیسر سمجھ رہا تھا اور اس کی وجہ اُن کی جیپ تھی۔ اب شہزاد کے لیے مداخلت ناگزیر ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور پھر بس کے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے؟''

''آپ کی تعریف جناب؟'' ڈرائیور نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''اُدھر دیکھو۔'' شہزاد نے اپنی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہ ہے میرا تعارف، کافی ہے کہ مزید کراؤں؟''

جیپ کو دیکھ کر ڈرائیور کے غبارے سے یوں ہوا نکلی جیسے ہمارے ہاں اکثر پانی کے نلکوں سے نکلتی رہتی ہے۔ ویسے بھی اُن دنوں مُلک میں مارشل لا نافذ تھا۔ چنانچہ ڈرائیور کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ایک آرمی آفیسر کے سامنے اُس کی اوقات ہی کیا تھی، سو وہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنے کلینر پر چڑھ دوڑا۔''گدھے کے بچے! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا، اِس نے جب کرایہ دے دیا تھا تو تم نے اس کا ٹکٹ کیوں نہیں کاٹا؟ اس کا مطلب

ہے کہ تم ٹکٹوں میں گھپلا کرتے ہو؟“

”اُستاد جی! یہ ......یہ......تم کیسی بات کرر ہے ہے.....میں بھلا ایسا کیوں کروں گا؟“ کلینر نے بوکھلا کر جواب دیا۔

”بکواس مت کرو۔“ ڈرائیور نے اُسے ڈانٹ پلائی اور پھر شہزاد سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔” صاب! غلطی میرے کلینر کی ہے، مگر اس کی جگہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔“

”کلینر کی کوئی غلطی نہیں ہے۔“ ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔”اُس نے میرا اور میری بیٹی کا ٹکٹ کاٹا تھا مگر تم نے ہماری سیٹ پر اپنے دوستوں کو بٹھا کر جان بوجھ کر ہم پر الزام لگا دیا کہ ہم بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہے ہیں۔ اب شرافت اسی میں ہے کہ ہمارا کرایہ واپس کر دو، ہم تم جیسے بے ایمان شخص کے ساتھ سفر کرنا نہیں چاہتے۔“

”نہیں ابا ایسا مت کریں ہم لیٹ ہو جائیں گے۔“ لڑکی نے مداخلت کی۔”ہم اسی بس میں سفر کریں گے۔“

”کبھی نہیں۔“ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔”میں یہاں سے پیدل گلگت چلا جاؤں گا لیکن اس بے ایمان کے ساتھ سفر نہیں کروں گا۔“

”اوئے! ان کا کرایہ واپس کر دو۔“ ڈرائیور نے کلینر کو حکم دیا۔

کلینر نے اُستاد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے، اُنھیں گنا اور پھر ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔”گن لو پورے ہیں میں نے ایک روپیا بھی نہیں نکالا، حالانکہ یہاں تک پورے بیس روپے کرایہ بنتا ہے۔“

”مجھ پر احسان مت کرو۔“ ادھیڑ عمر شخص نے دس دس کے دو نوٹ کلینر کو واپس کر دیے۔

معاملہ رفع دفع ہوتے ہی تمام سواریاں اپنی اپنی نشست پر جا بیٹھیں۔ ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کی اور پھر تیزی کے ساتھ ریسٹورنٹ کے احاطے سے نکل کر پختہ روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب ریسٹورنٹ کے احاطے میں وہ باپ بیٹی، شہزاد اور جمال رہ گئے تھے۔

”انکل! آپ نے بس چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔“ شہزاد اُس سے مخاطب ہوا۔”جب کہ آپ کے ساتھ بیٹی بھی ہے۔“

وہ بولا۔”بات اچھے برے کی نہیں ہے بیٹے! بلکہ اصول کی ہے۔ بے ایمان شخص کی معیت میں سفر کرنا مجھے

پسند نہیں ہے اور نہ ہی اسے میرا ضمیر گوارا کرتا ہے۔"

"اچھی بات ہے انکل.... لیکن آپ کو جانا کہاں ہے؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"گلگت...... وہاں میں ایک اسکول میں پڑھاتا ہوں۔"

"اوہ..... تو آپ ایک استاد ہیں۔ آپ کا اسم شریف؟"

"احمد حسین۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اگر آپ محسوس نہ کریں تو ہم آپ کو اپنے ساتھ گلگت تک لے جاسکتے ہیں۔" شہزاد نے اُسے پیش کش کی۔ "ہم بھی گلگت ہی جا رہے ہیں۔"

"شکریہ بیٹے! تم لوگ کیوں تکلیف کیوں اُٹھاتے ہو۔ ہم بس سے چلے جائیں گے، ابھی تھوڑی دیر کے بعد دوسری بس آجائے گی۔"

"انکل! اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے؟" جمال جو اتنی دیر سے چُپ تھا مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم کوئی آپ لوگوں کو کندھے پر اُٹھا کر تو نہیں لے جائیں گے..... جیپ ہے ہمارے پاس بالکل نویں نکور۔"

"یہ کون ہے؟" ماسٹر احمد نے شہزاد سے پوچھا۔

"یہ جمال احمد بدبخت ہے اور بدقسمتی سے میرا دوست ہے۔" شہزاد نے ہنس کر بتایا۔

"یہ کیسا نام ہے بھئی؟" ماسٹر نے چونک کر سوال کیا۔

"شاعروں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں انکل..... دراصل بدبخت اس کا تخلص ہے۔ کافی مشہور شاعر ہے، بس کوئی چھاپتا نہیں ہے اسے ورنہ آج اس کے بے شمار فین ہوتے اور لوگ احمد فراز کو بھول کر........"

"یہ بکواس کر رہا ہے انکل۔" جمال نے قطع کلامی کی۔ "میں تو شاعروں اور شاعری کے سخت خلاف ہوں، تاہم یہ حضرت خود یہ نامعقول شوق رکھتے ہیں اور ایک گھٹیا میگزین میں اس کی شاعری چھپتی بھی رہتی ہے۔ ایک بار اس نے اپنی شاعری ایک ادبی میگزین کو بھجوائی تو میگزین کے ایڈیٹر کا جواب آیا سوری جناب ہم لطیفے نہیں چھاپتے۔"

ماسٹر احمد نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیوں بھئی! کیا تمہارا دوست سچ کہہ رہا ہے؟“

شہزاد نے کہا۔ ”اس میں صرف اتنا سچ ہے کہ میں شاعری کرتا ہوں بقیہ ساری بکواس کو آپ کسی سیاسی لیڈر کا بیان سمجھ لیجیے۔“

”بہت خوب بھئی۔“ ماسٹر نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ ”سیر پہ سوا سیر والا معاملہ ہے۔ ویسے تم دونوں مجھے آرمی سے نہیں لگتے ہو اور ابھی تک تم لوگوں نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا حالانکہ سب سے پہلے تعارف کرایا جاتا ہے۔“

”تعارف کا موقع ہی کہاں ملا ہے انکل۔“ شہزاد بولا۔ ”ویسے میرا نام شہزاد علی ہے جب کہ میرے دوست کا نام آپ کو معلوم ہے۔ ہم دونوں کا تعلق پنجاب سے ہے اور ابھی ابھی یونی ورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوئے ہیں۔ میرے ابو ایک روایتی قسم کے زمین دار ہیں جب کہ یہ حضرت ایک پروفیسر کے برخوردار ہیں۔ میں ایک ”پینڈو“ ہوں اور یہ شہری بابو ہیں۔ اس وقت ہم دونوں گلگت اسکردو کی سیر کے لیے جا رہے ہیں۔“

اس کے بعد ماسٹر کے استفسار پر شہزاد نے اُسے اپنے اور جمال کے متعلق سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ اُن کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد ماسٹر بولا۔ ”ٹھیک ہے میں تم لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“ شہزاد نے متحیر ہو کر پوچھا۔

”میرا گھر گلگت میں ہے اور وہاں تم لوگ مجھے میزبانی کا موقع ضرور دو گے۔“

”اوکے ہمیں منظور ہے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

☆......☆......☆

میمونہ بستر پر اوندھی لیٹی ہچکیوں میں رو رہی تھی کہ ایسے ہی وقت اُن کی گھریلو ملازمہ رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی اور پریشانی کے عالم میں بولی۔ ”بی بی جی! وہ صاحب اپنے کمرے میں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور اُن کا دایاں ہاتھ بھی بہت بُری طرح زخمی ہے۔“

”کیا.....کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔“

”خود چل کر دیکھ لیں بی بی جی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ ملازمہ نے جواب دیا۔

میمونہ بستر سے اُتر کر ننگے پیر تقریباً دوڑتی ہوئی علی کے کمرے داخل ہوئی تو واقعی علی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔
اُس نے فوراً علی کا سیل فون اُٹھایا اور اپنے فیملی ڈاکٹر کا نمبر پنچ کرنے لگی۔ ''ہیلو.....'' رابطہ ہوتے ہی وہ چلائی۔ ''
پلیز ڈاکٹر صاحب! جلدی سے آ جائیں.....وہ.....وہ علی اپنے بیڈروم میں بے ہوش پڑے ہیں اور ان کا دایاں
ہاتھ بھی بُری طرح زخمی ہے......پلیز جلدی کریں۔''

''او کے مسز علی! ڈونٹ وری میں ابھی آ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ڈاکٹر کا کلینک اُن کے گھر کے نزدیک ہی واقع تھا چنانچہ وہ پندرہ بیس منٹ کے اندر ہی وہاں پہنچ گیا۔ اُس
وقت تک علی بھی ہوش میں آ چکا تھا۔ تاہم اُس کے زخمی ہاتھ کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بینڈیج کر دی
تھی۔ میڈیسن ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تھا۔ اُس نے کچھ پین کلر اور کچھ زخم کو خشک کرنے والی ٹیبلٹس میمونہ کے
حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تین روز تک بلا ناغہ انھیں دیتی رہنا، ان شاء اللہ یہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ویسے
میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کے ہاتھ کا یہ حشر کس نے کیا ہے؟''

ڈاکٹر کا یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی جواب دینے کی بجائے ایک دوسرے کی شکل
دیکھنے لگے۔ گو کہ وہ اُن کا فیملی ڈاکٹر تھا مگر وہ اُسے اپنے نجی معاملات میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں
تھے۔ ویسے بھی یہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ اگر وہ ڈاکٹر کو بتا دیتے تو پورے محلے میں علی بدنام ہو کر رہ جاتا اور یہ بدنامی
اُنھیں کسی صورت قبول نہیں تھی۔ اُن کا تعلق اپر کلاس سے تھا۔ سو وہ اپنے معاملات کسی کے ساتھ شیئر کرنا بہت
معیوب سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر نے اُنھیں کش مکش کا شکار دیکھا تو اپنائیت سے بولا۔ ''آپ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور میں گزشتہ
پانچ برسوں سے آپ کا فیملی ڈاکٹر چلا آ رہا ہوں، فیملی ڈاکٹر کی حیثیت گھر کے ایک فرد جیسی ہوتی ہے۔ اگر کوئی
ایسی ویسی بات ہے تو آپ بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتے ہیں۔ میں آپ کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ حل
نہ کر سکا تو تب بھی وہ مسئلہ مجھ تک محدود رہے گا۔''

علی نے ایک نظر میمونہ پر ڈالی اور بولا۔ ''جاؤ ملازمہ سے چائے لانے کا کہہ دو، تب تک میں ڈاکٹر صاحب
سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرتا ہوں۔''

''ہاں اب بتاؤ معاملہ کیا ہے۔آپ بہت ڈسٹرب لگتے ہیں؟'' میمونہ کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر نے سوال کیا۔

علی لمحہ بھر کے لیے کھوسا گیا یوں جیسے گزرے واقعات کی کڑیاں ترتیب دے رہا ہو، پھر سر جھکا کر بولا۔'' ڈاکٹر صاحب! میں بہت مطمئن اور پُر آسائش زندگی بسر کر رہا تھا مگر اب میرا اطمینان رخصت ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ ایک خواب کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ خواب بہت عجیب وغریب ہے۔ میں آپ کو اس خواب کے متعلق بتا بھی دوں تو تب بھی آپ اس پر یقین نہیں کریں گے بلکہ اُلٹا مجھے پاگل سمجھیں گے۔ ہنسیں گے مجھ پر۔''

''آپ بلا جھجک ہو کر بتائیں۔'' ڈاکٹر نے دل چسپی کا اظہار کیا۔''دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر اپنے مریض کا مذاق نہیں اُڑا سکتا۔''

ڈاکٹر کے اصرار پر علی نے بلا کم وکاست اُسے اپنے خوابوں کے متعلق بتا دیا۔ پھر بولا۔''اِن خوابوں نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے، میری بیوی مجھ پر شک کرنے لگی ہے۔ اُس کے اور میرے درمیان فاصلے پیدا ہونے لگے ہیں۔ ہم دونوں کے بیچ ہونے والے جھگڑوں کا اثر ہمارے بیٹے فیضان پر بھی پڑنے لگا ہے۔ میں ان خوابوں اور روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ چکا ہوں مگر خواب ہیں کہ میری جان ہی نہیں چھوڑتے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟.....نہ خوابوں پر میرا اختیار چلتا ہے اور نہ ہی میمونہ مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے تیار ہے۔''

''آپ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟'' ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔'' ایک بہت اچھے ماہر نفسیات میرے دوست ہیں، اُن سے ٹائم لے لیتے ہیں۔ اللہ بہتر کرے گا یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''ماہر نفسیات تو اچھے خاصے انسان کو پاگل بنا دیتے ہیں یا پھر ایسی میڈیسن دیتے ہیں کہ انسان اُن کا عادی بن کر رہ جاتا ہے۔ قبر تک یہ دوائیں انسان کے ساتھ رہتی ہیں.......سوری میں اپنا تماشا نہیں بنا سکتا۔''

''یہ صرف کم فہم لوگوں کی رائے ہے۔ ہر ماہر نفسیات ایسا نہیں ہوتا اور ویسے بھی آج کل میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا دوست ڈاکٹر فرقان حیدر آپ کا یہ مسئلہ چند دنوں میں حل کر دے گا۔ بہت قابل شخص ہے۔ اُس کے کریڈٹ پر ایسے کیسز بھی ہیں جو مکمل پاگل تھے مگر آج وہ نارمل زندگی جی رہے ہیں۔''

اسی دوران ملازمہ کی بجائے میمونہ خود چائے لے کر پہنچ گئی جس کے ساتھ ہلکے پھلکے کھانے کے لوازمات بھی تھے۔اُس نے چائے بنا کر اُن دونوں کو پیش کی اور ساتھ ہی بسکٹ کی پلیٹ آگے سرکا دی۔

''مسز علی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' ڈاکٹر نے گرم گرم چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔'' خالی چائے ہی کافی تھی۔''

''دراصل علی نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے تو میں نے سوچا کہ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی ہونا چاہیے۔''

ڈاکٹر مسکرایا۔'' تو یوں کہو ناں! کہ شوہر نامدار کی خدمت ہو رہی ہے۔''

''نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔آپ بھی کھا سکتے ہیں۔''

''ہاں..... ہاں ڈاکٹر صاحب لیجئے ناں۔'' علی نے ایک پلیٹ ڈاکٹر کی طرف کھسکا دی۔

''نہیں بھئی نہیں، میں صرف ایک بار ناشتا کرتا ہوں اور خوب ڈٹ کر کرتا ہوں۔اب لنچ سے پہلے کچھ بھی کھانے کی گنجائش نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنا بیگ اُٹھایا اور اجازت طلب انداز میں بولا۔'' اوکے علی صاحب! میں چلتا ہوں لیکن میری بات پر غور ضرور کرنا۔''

''میں سوچوں گا ڈاکٹر صاحب۔'' علی نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

گلگت میں ماسٹر احمد حسین کے گھر میں رہتے ہوئے شہزاد اور جمال کو تین دن ہو چکے تھے۔ماسٹر احمد اُن کی خوب خاطر مدارات کر رہا تھا۔وہ واقعی ایک مہمان نواز شخص تھا۔اس دوران اُن دونوں نے جی بھر کر گلگت کی سیر کی تھی۔اُونچے فلک بوس پہاڑوں پر چڑھائی کی تھی۔سرسبز و شاداب وادیوں میں گھومے پھرے تھے۔بادام، اخروٹ اور خوبانیوں کے باغات دیکھے تھے۔خاص کر وہاں کی خوبانی تو لاجواب تھی۔خوب موٹی اور سفید، رس اور لذیذ گودے سے بھری ہوئی جسے کھاتے ہوئے انسان کو لطف آجاتا تھا۔جمال نے خوب ڈٹ کر خوبانیاں کھائی تھیں۔تاہم شہزاد اُس کی طرح پیٹو نہیں تھا۔ہاں سیر کرنے اور گھومنے پھرنے کا شہزاد کو بے حد شوق تھا۔وہ

روزانہ صبح سویرے ناشتا کرنے کے بعد سیر کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ ناشتا اُن کی لیے ماسٹر احمد کی بیٹی لایا کرتی تھی۔ اُس کا نام سنبل احمد تھا اور وہ میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی۔ بے حد حسین وجمیل اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اُن دونوں کی بہت عزت کرتی تھی۔ جمال کو وہ بھائی کہہ کر پکارتی تھی جب کہ شہزاد کو آپ یا جناب کہتی تھی۔ سنبل کے علاوہ ماسٹر کا ایک بیٹا بھی تھا جو پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا اور اُس کا نام ریحان تھا۔ ان تین دنوں کے اندر ہی شہزاد سنبل کے لیے اپنے دل میں لطیف جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ سنبل بھی اُسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتی تھی مگر ابھی تک اُن دونوں کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جسے محبت کا نام دیا جا سکتا۔

چوتھے روز جب سنبل اُن کے کمرے میں ناشتا لے کر پہنچی تو اُس وقت شہزاد نہا دھو کر تیار ہو چکا تھا جب کہ جمال حسب معمول خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

''یہ آپ کا دوست سوتا بہت ہے۔'' وہ ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''ارے مسئلہ کیا چیز ہے یہ حضرت تو سرتاپا مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ مُلک کو اتنے مسائل درپیش نہیں ہیں، جتنے اس بے چارے کو ہیں۔ اب میں آپ کو اس کا کون کون سا مسئلہ بتاؤں؟''

وہ مسکرائی۔ ''سبھی بتادو...... ہوسکتا ہے ابو کے پاس ان کے کسی مسئلے کا حل موجود ہو؟''

''آپ کے ابو کے پاس میرے نہیں بلکہ اس کے مسئلے کا حل موجود ہے اگر آپ تعاون فرمائیں تو اس بچارے کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔'' جمال نے لحاف سے سر نکال کر جواب دیا اور سنبل جھینپ کر رہ گئی۔

''بکواس مت کرو۔'' شہزاد نے آنکھیں نکالیں۔ ''ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک کہتے ہو تم سے بُرا ہو بھی کون سکتا ہے؟...... یہ تو میں ہوں کہ تمہارے ساتھ گزارا کر رہا ہوں۔''

''تمہارا باطن تمہارے ظاہر سے زیادہ کالا ہے۔ اسی لیے تو زبان سے کبھی اچھی بات نہیں نکلتی۔''

''اب میرا بھائی اتنا کالا بھی نہیں ہے۔'' سنبل نے مداخلت کی۔ ''بس تھوڑا سا سانولا ہے۔''

''واہ کیا کہنے بھئی۔'' جمال نے نعرہ لگایا۔ ''بہن ہو تو ایسی...... ویسے اباجی کہتے ہیں کہ میں سانولا نہیں ہوں بلکہ پکے رنگ کا ہوں۔''

’’انکل بالکل ٹھیک کہتے ہیں، کالا رنگ پکا رنگ ہی تو ہوتا ہے۔ چاہے جتنی کریمیں بھی استعمال کر لو رنگ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔‘‘

’’چلو کوئی بات نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ کالے دل والے ہوتے ہیں اور گورے ہرجائی۔ اپنی میڈم نے بھی تو یہی گایا ہے ناں کہ کالا شاہ کالا میرا کالا اے دلدار تے گورے آں نوں پراں کرو۔‘‘ جمال نے باقاعدہ گا کر جواب دیا۔

’’لیکن میڈم نے سارے دلدار تو گورے رنگ کے ہی چنے تھے۔ اُن میں تو کوئی ایک بھی تیری طرح کا حبشی نہیں تھا۔‘‘

’’زبان نوں لگام دے اوئے بے غیرتا!‘‘ جمال لحاف پھینک کر بستر پر کھڑا ہو گیا۔ ’’میں تے نتھ پا دیاں گا۔‘‘

’’کیا بات ہے جمال بھائی کی۔‘‘ سنبل نے ہنس کر کہا۔ ’’اس طرح تو کوئی فلمی ہیرو بھی نہیں بول سکتا۔‘‘

’’اس گدھے نے سلطان راہی کی سب فلمیں دیکھ رکھی ہیں۔ اس کا جنرل نالج بس پنجابی فلموں تک ہی محدود ہے۔‘‘

’’پنجابی فلموں تک کیوں محدود ہے؟.....میں نے ہسٹری میں ایم اے کیا ہے جو دل چاہے پوچھ لو؟‘‘ جمال نے سینہ پھلاتے ہوئے جواب دیا۔

’’او کے۔‘‘ شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’محمد بن قاسم کے سسر کا کیا نام تھا اور وہ کس عہدے پر کام کرتے تھے؟‘‘

’’یہ سوال ہی غلط ہے؟‘‘

’’کیوں غلط ہے؟‘‘

وہ بولا۔ ’’سیدھی سی بات ہے عرب کئی کئی شادیاں کرتے ہیں، اب مجھے کیا معلوم کے اُس کے کتنے سسر تھے؟‘‘

’’چلو تم اُس کے کسی ایک سسر کا نام بتا دو؟‘‘

’’نہیں معلوم......تم کوئی دوسرا سوال پوچھ لو۔‘‘

''اوکے.....یہ بتاؤ کیا لیلیٰ سچ مچ کالی تھی؟''

''مجھے کیا پتا.....کیا وہ میرے ماموں کی بیٹی تھی؟'' اُس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ ہیر کا چچا کس پاؤں سے لنگڑا تھا؟''

''میں رانجھا نہیں ہوں یار۔'' وہ چلایا۔

''ایم اے ہسٹری تو ہو ناں؟''

''جہنم میں گئی ہسٹری۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے باتھ روم گھس گیا۔شہزاد نے اُس کی بے بسی پر ایک قہقہہ لگایا اور پھر سنبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''دیکھا آپ کا بھائی کس قدر ذہین ہے۔میں نے تین سوال پوچھے مگر اُسے کسی سوال کا جواب بھی معلوم نہیں تھا۔''

وہ بولی۔''آپ کے سوال ہی اوٹ پٹانگ تھے، وہ کیا جواب دیتا؟''

''چلو تو پھر آپ ہی ایک آسان سے سوال کا جواب دے دیں؟''

''پوچھیے۔''

''میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟''

''مم.....مجھے.....کیا پتا جی۔'' اُس نے شرما کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

علی اُس وقت ماہر نفسیات ڈاکٹر فرقان حیدر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اُسے اپنے مسئلے سے آگاہ کر چکا تھا۔فرقان حیدر شہر کا مانا ہوا ماہر نفسیات تھا اور کئی پے چیدہ قسم کے کیس نمٹا چکا تھا۔اُس نے علی کی بات پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ سُنی تھی۔

''مسٹر علی! یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔خواب سبھی انسان دیکھتے ہیں، میں بھی دیکھتا ہوں۔بس آپ ان خوابوں کو سنجیدگی سے نہ لیا کریں یہ خود بخود آپ کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔آپ ان کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیں۔'' ساری تفصیل سننے کے بعد ڈاکٹر فرقان نے علی کو مشورہ دیا۔

وہ بولا۔" ڈاکٹر صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر میں گزشتہ دوماہ سے مسلسل ایک ہی خواب دیکھتا آرہا ہوں۔خواب کی ترتیب میں معمولی سا بھی ردوبدل نہیں ہوتا۔وہی وادی، وہی نظارے، وہی چشمہ، وہی عورت، وہی میں.....حتیٰ کہ اُس عورت کے جانے کے بعد میں جو الفاظ بولتا ہوں وہ بھی کبھی نہیں بدلے۔"

"اوکے۔" ڈاکٹر نے سر کو اثباتی جنبش دی۔" کیا وہ عورت آپ کے لیے قطعی اجنبی ہے یا کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔"

"بالکل اجنبی ہے لیکن اُسے دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔"

"یاد کرنے کی کوشش کرو، کچھ شکلیں انسان کے شعور میں محفوظ نہیں ہوتیں لیکن لاشعور میں موجود ہوتی ہیں۔"

"میں ایسی کئی کوششیں کر چکا ہوں، ہمیشہ ناکامی ہوئی ہے۔"

"مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"میرے ماضی سے اس عورت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"کیوں کہ میرا ماضی عورت کے بغیر گزرا ہے۔"

"وہ کس طرح.....کیا آپ آسمان سے ٹپکے ہیں؟" ڈاکٹر نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔" بہن نہ سہی لیکن ماں تو ضرور ہوگی؟"

"ماں نے مجھے عالم نزع میں جنم دیا تھا۔"

"اوہ.....ویری سیڈ۔" ڈاکٹر نے افسوس کا اظہار کیا۔" اُمید ہے آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔دراصل ہمیں مریضوں سے ایسے سوالات کرنا پڑتے ہیں، یہ ہماری پروفیشنل مجبوری ہے۔"

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب میں سمجھتا ہوں۔"

"اٹس اوکے.....ماں کے بعد آپ کی پرورش کس نے کی تھی؟"

"ابو نے۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"امپوسیبل۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔" مرد بھلا ایک شیر خوار بچے کی پرورش کس طرح کرسکتا ہے؟ اُسے

نہلانا دھلانا، فیڈ کرنا، اُس کی گندگی صاف کرنا، یہ کوئی آسان کام تو نہیں ہیں، لازماً انھوں نے کسی آیا یا نرس وغیرہ کا بندوبست کیا ہوگا۔ ایک عورت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے؟''

''آپ بجا فرما رہے ہیں، بہرکیف اس ناممکن کو میرے ابو نے ممکن بنا دیا تھا۔''

''کیا وہ زندہ ہیں؟''

''جی......وہ......ہاں......'' وہ قدرے نروس ہوگیا پھر ایک دم سنبھل کر بولا۔ ''بالکل زندہ ہیں جی۔''

''واقعی آپ کے ابو ایک عظیم انسان ہیں۔'' ڈاکٹر نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''ایسے عظیم انسانوں ہی کی وجہ سے تو یہ دنیا قائم ہے۔ رئیلی مسٹر علی! آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں جسے اس قدر پیار کرنے والا باپ ملا.... ورنہ آج کے دور میں تو بچے اپنے باپ کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترستے رہتے ہیں۔ باپوں کو اتنی فرصت ہی نہیں..........''

''پلیز ڈاکٹر.....'' اُس نے یوں قطع کلامی کی جیسے ڈاکٹر نے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ''میں یہاں اپنے ابو کی تعریف سننے کے لیے نہیں آیا۔''

''ایم سوری۔'' ڈاکٹر نے نادم ہوکر کہا۔ ''مجھے آپ کی پرسنل لائف میں مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔''

''اوکے۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''اب آپ کے مرض ہی کے متعلق بات ہوگی۔ یہ بتائیں کہ جب خواب کے دوران آپ کی قوتِ گویائی سلب ہوتی ہے تو اُس وقت آپ کیا فیل کرتے ہیں۔ غصہ، جھنجلاہٹ یا مایوسی؟''

''بے حد مایوسی اور دُکھ محسوس کرتا ہوں۔ اپنے تئیں بولنے کی بہت کوشش کرتا ہوں لیکن میری زبان تالو سے چپک کر رہ جاتی ہے۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ میں اپنی اُس وقت کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔''

''کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

''جی ہاں کی ہے اور اب وہ میری بیوی ہے۔'' اُس نے بلا جھجک جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مسٹر علی! فی الحال میں آپ کے لیے چند میڈیسن تجویز کردیتا ہوں۔ اُمید ہے آپ کا مسئلہ حل

ہو جائے گا۔" اس کے بعد ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر چند لائنیں گھسیٹیں اور پھر وہ کاغذ پیڈ سے کھینچ کر علی کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ ڈاکٹر۔" علی نے کاغذ لیتے ہوئے اجازت طلب انداز میں کہا اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر کلینک سے باہر آگیا۔

☆......☆......☆

سنبل کا شرما کر بھاگ جانا شہزاد کے لیے گرین سگنل تھا۔ چنانچہ اب وہ کسی ایسے موقعے کا منتظر تھا جب وہ کھل کر سنبل سے اظہار محبت کر سکتا۔ جمال اُن دونوں کے دلی جذبات سے آگاہ تھا لیکن اُسے شہزاد کا سنبل میں دل چسپی لینا پسند نہیں تھا کیونکہ وہ شہزاد کے والد چودھری مُراد علی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چودھری صاحب کبھی بھی سنبل کو بطور بہو کے قبول نہیں کریں گے۔ جمال کے نزدیک اُن دونوں کی یہ محبت کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی مگر وہ شہزاد کو کوشش کے باوجود اپنے اس خدشے سے اب تک آگاہ نہیں کر سکا تھا۔ اُس روز جب رات کا کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو یونہی باتوں باتوں میں شہزاد نے سنبل کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یار! میں سنبل کے متعلق سنجیدہ ہوں، مجھے کوئی مشورہ دو..... کیا کروں؟"

"تیرے سنجیدہ ہونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" جمال نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں ہوگا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔" اُس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"اُس نے کب کیا ہے تم سے محبت کا اظہار؟"

"اظہار محبت تو ابھی تک میں نے بھی نہیں کیا اُس سے۔"

"تو پھر کیا تجھے الہام ہوا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے؟"

وہ بولا۔ "محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی میرے دوست! یہ تو نگاہوں سے محسوس کیے جانے والے ایک جذبے کا نام ہے، جو دل میں نہاں ہوتا ہے وہ آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے۔ میں نے اُس کی آنکھیں پڑھی ہیں، وہ سو فی صد مجھ سے پیار کرتی ہے۔"

"تم نے سنبل کی آنکھیں تو پڑھ لی ہیں لیکن شاید انکل مُراد کی آنکھیں کبھی نہیں پڑھیں۔ وہ کبھی بھی سنبل

کو بہو کی صورت میں قبول نہیں کریں گے، اس لیے اپنے دل سے یہ خیال نوچ کر پھینک دو ورنہ تیرے ساتھ بہت بُرا ہوگا۔ تم کہیں کے بھی نہیں رہو گے۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"مطلب تم آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو چکے ہو؟"

"ہاں۔" اُس کے لہجے سے عزم جھلکنے لگا۔ "میں اس آگ میں کودنے کا حتمی فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ آگ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گل وگلزار ہوئی تھی؟"

"جذبہ سچا ہو تو آگ کا سمندر بھی عبور کیا جا سکتا ہے۔"

"ایسے ڈائیلاگ فلموں میں اچھے لگتے ہیں اور جن پر فلمائے جا رہے ہوتے ہیں وہ عملی زندگی میں ایک ندی بھی عبور نہیں کر سکتے اور وہ بھی پانی والی.... آگ تو دُور کی بات ہے۔ آدمی بنو عاشق مت بنو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

"تم دوست ہو میرے کہ دشمن؟" وہ جھنجھلا گیا۔ "میں نے تم سے مشورہ مانگا ہے، لیکچر دینے کو نہیں کہا۔"

"یہ مشورہ ہے لیکچر نہیں ہے اور میں دوست بن کر ہی تمہیں دے رہا ہوں۔ تمہیں اگر یہ لیکچر لگتا ہے تو بھاڑ میں جاؤ، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کرو گے؟" اُس نے مایوسی کے عالم میں پوچھا۔

"کیوں نہیں کروں گا؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "انکل مُراد جب جوتے مار کر تمہیں گھر سے آؤٹ کریں گے تو سیدھے میرے پاس چلے آنا، کھانا پینا اور رہائش فری ملے گی۔ اس سے زیادہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"لعنت ہے تم پر ایک بار نہیں سو بار۔"

"سو بار کیوں، بے شمار بار بھیجو.... مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

"اچھا اب بکواس نہیں کرو۔" اُس نے غصے سے کہا اور دندناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اُس کا رُخ گھر کے لان کی طرف تھا۔ وہ ٹہلنا چاہتا تھا، جمال کی باتوں نے اُسے پریشانی میں مبتلا کر دیا

تھا۔ جونہی اُس نے طویل کاریڈور عبور کیا ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ لان میں ماسٹر احمد کے ساتھ کوئی شخص بحث میں اُلجھا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہ دونوں اُسے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ماسٹر احمد قدرے نیچی آواز میں بول رہے تھے جب کہ دوسرا شخص سخت طیش کے عالم میں تھا اور اُس کی آواز واضح طور پر شہزاد کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''مجھے سنبل کا رشتہ چاہیے یا پھر دو دنوں کے اندر اپنی رقم.....فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' وہ جو کوئی بھی تھا بڑی بدتمیزی کے ساتھ بول رہا تھا۔

سنبل کا نام سن کر شہزاد کا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ وہ دونوں اُس سے تقریباً تیس گز کی دُوری پر چھوٹے سے لان کے وسط میں کھڑے ہوئے تھے۔ لان کے اردگرد پھولوں اور مختلف قسم کے پودوں کی کیاریاں تھیں جب کہ وسط میں امریکن گھاس تھی۔ اُن دونوں کے نزدیک دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں مگر وہ بیٹھنے کی بجائے کھڑے ہوئے تھے۔

''اپنی گندی زبان سے میری بیٹی کا نام مت لو۔'' ماسٹر احمد نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''واہ ماسٹر جی واہ۔'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''اب میری زبان گندی ہوگئی ہے.......اگر تم سنبل کے باپ نہ ہوتے تو میں تجھے ابھی مزا چکھادیتا۔''

''شمیر خان! میری برداشت کا امتحان مت لو۔'' ماسٹر نے طیش کے عالم میں کہا۔ ''ورنہ دھکے مار کر یہاں سے نکال دوں گا۔''

''شمیر خان کو دھکے مارنے والا ابھی پیدا ہی نہیں ہوا، تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟........دو ٹکے کے ماسٹر! تمہاری اتنی اوقات ہے کیا کہ مجھے دھکے مار کر نکال سکو؟''

''تم فوراً دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' ماسٹر تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے چلایا۔

''نہیں جاتا۔'' اُس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''جو کچھ بگاڑنا ہے بگاڑ لو.....میں بھی تو دیکھوں کہ تم کتنے بڑے طرم خان ہو؟''

ماسٹر کی قوتِ برداشت جواب دے گئی، ایک سیکنڈ میں اُس کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پھر ''چٹاخ'' کی آواز آئی۔ تھپڑ شمیر خان کے گال پر پڑا تھا۔

''حرام زادے۔'' تھپڑ کھا کر شمیر خان پاگل ہو گیا اور بھوکے گدھ کی طرح ماسٹر پر جھپٹ پڑا۔ اُس نے ماسٹر کو گریبان سے پکڑا اور اُس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ماسٹر نہ صرف اُس کے مقابلے میں کمزور بلکہ ڈھلتی ہوئی عمر کا شخص تھا۔ جوابی وار کرنا تو دُور کی بات تھی وہ بے چارا تو اپنا دفاع کرنے سے بھی قاصر تھا۔

اب شہزاد کے لیے مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا لان میں داخل ہوا اور شمیر خان کو عقب سے جکڑ لیا۔ شمیر خان نے اُسے ایک گالی دیتے ہوئے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا مگر شہزاد کی مضبوط گرفت سے نہ نکل سکا۔ تب وہ جھنجھلا کر شہزاد کو ننگی گالیاں دینے لگا۔ شہزاد جو پہلے ہی غصے سے کھول رہا تھا، گالیاں سن کر مزید غصے میں آ گیا۔

''میں نے تیرے جیسا بے غیرت انسان آج تک نہیں دیکھا۔'' شہزاد نے اُس کی پیٹھ پر ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بوڑھے پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بھی تجھے شرم نہیں آئی؟''

''تم کون سے غیرت مند ہو..... مجھے دھوکے سے پکڑ کر خود کو ہیرو سمجھ رہے ہو؟.... ایک بار مجھے چھوڑ دو پھر میں تجھے بتاتا ہوں کہ غیرت کسے کہتے ہیں؟'' شمیر خان نے اُسے طعنہ دیتے ہوئے جواب دیا۔

اُس کا طعنہ سن کر شہزاد کے تن من میں جیسے آگ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے اُسے چھوڑ دیا اور اپنی شرٹ کی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آ جا اور دکھا مجھے غیرت...... کم آن ہٹ می...... شاباش..... جلدی کرو......''

''نہیں بیٹے!'' ماسٹر نے مداخلت کی۔ ''تم اس غنڈے کے منہ مت لگو..... یہ بہت خطرناک......''

''آپ بس تماشا دیکھیں انکل۔'' شہزاد نے قطع کلامی کی۔ ''میں اس گیدڑ کا کیسے حلیہ بگاڑتا ہوں؟''

''تیری تو.........'' شمیر خان نے ایک گالی بکتے ہوئے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ مگر شہزاد غافل نہیں تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا اور شمیر خان اپنے ہی زور میں زمین سے جا ٹکرایا، پھر اس سے قبل کہ وہ دوبارہ اُٹھ کر اپنے پیروں پہ کھڑا ہوتا، شہزاد کی لات اُس کی تشریف پر پڑی اور وہ جو اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا دوبارہ زمین بوس ہو گیا۔ اب اُس کے منہ سے بوچھاڑ کی صورت میں گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ شہزاد کی ماں بہن ایک کر رہا تھا اور اُس کا شجرہ بعض ناپاک جانوروں سے جوڑ رہا تھا لیکن شہزاد نے اُس کی بکواس پر کوئی توجہ نہ

دی۔ اپنی زبان گندی کرنے کی بجائے اُس نے اُس کی ٹھکائی کرنا مناسب سمجھا کہ یہی اُس کا بہترین علاج تھا۔

''اُٹھ مرد بن.....زنخے کی اولاد۔'' شہزاد نے دوسری لات اُس کے پہلو میں رسید کرتے ہوئے کہا اور شمیر خان کی چیخ نکل گئی۔

''چلاؤ مت........غیرت ہے تو اب اُٹھ کر دکھاؤ۔'' شہزاد نے حقارت سے کہا اور پھر اُسے لاتوں پہ رکھ لیا۔ وہ ایک فربہ بدن درمیانے سے قد کا بلتستانی تھا جب کہ شہزاد اُس کے مقابلے میں چھریرے بدن کا مالک تھا اور قد میں بھی اُس سے اُونچا تھا۔ دورانِ تعلیم مارشل آرٹ سے بھی اسے لگاؤ رہا تھا۔ اگرچہ اپنے اس شوق کو اُس نے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا تھا مگر پھر بھی بہت سارے داؤ پیچ وہ سیکھ گیا تھا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں اُس نے شمیر خان کی کچھ اس طرح سے دھلائی کی جیسے ملٹری کے دھوبی ملٹری یونی فارم کی کرتے ہیں۔ شمیر خان کی چیخیں سن کر جمال سمیت ماسٹر کے سارے گھر والے لان میں جمع ہو چکے تھے۔ جمال نے بڑی مشکل سے شمیر خان کو شہزاد کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی۔ شمیر خان اب اُس کتے کی طرح ہانپ رہا تھا جو سوروں کے پیچھے دوڑتا رہا ہو۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا بیٹے۔'' معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی ماسٹر متفکرانہ انداز میں شہزاد سے مخاطب ہوا۔ ''تم لوگ تو چلے جاؤ گے مگر میں نے یہیں رہنا ہے۔ یہ شخص تو میرا اور میرے گھر والوں کا جینا دوبھر کر دے گا۔''

''یہاں کیا اس کے باپ کا راج ہے۔'' وہ بولا۔ ''آپ فکر کیوں کرتے ہیں، میں اس کا پکا بندوبست کر کے جاؤں گا۔''

''پکا بندوبست.....مگر کیسے؟'' ماسٹر نے الجھ کر پوچھا۔

''یہاں NLI (ناردرن لائیٹ انفنٹری) میں میرا ایک کزن کیپٹن ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل ملک میں مارشل لا نافذ ہے۔ بس آپ دیکھتے جائیں کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں؟ یہ آئندہ آپ کے سائے سے بھی دُور بھاگے گا۔''

''مم......مجھے جانے دیں جی۔'' شہزاد کا ارادہ جان کر شمیر خان فریادی انداز میں بولا۔ ''میں ماسٹر صاحب سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔''

"یہ غلطی نہیں تھی مسٹر غنڈا گردی تھی اور تمہیں اس کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔" شہزاد نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا اور پھر ماسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"انکل! آپ فون اُٹھا کر ہمارے کمرے میں لے آئیں، میں اور جمال اسے لے کر آ رہے ہیں۔"

"خد...خدا...کے لیے...........مم.........مجھے جانے دیں جی۔" شمیر خان گڑگڑایا۔ "مم......میں آئندہ......ماسٹر صاحب کے......نزدیک سے بھی نہیں گزروں گا۔ یہ میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر چھوڑ دیں جی۔"

"تمہیں شاید اُونچا سنائی دیتا ہے؟" جمال نے مداخلت کی۔ "چلو ورنہ اسکول کا زمانہ یاد دلا دیں گے.......ڈنڈا ڈولی کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟"

"مسخرہ بازی چھوڑو جمال۔" شہزاد نے اُسے ڈانٹا اور شمیر خان کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اپنے کمرے کی طرف لے جانے لگا، جب کہ جمال اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اُنھوں نے اُسے کمرے کے اندر پہنچا دیا، جہاں ماسٹر احمد پہلے ہی ٹیلی فون لیے موجود تھا۔

شہزاد نے اپنے کزن مدثر کا نمبر ملایا اور اُسے شمیر خان کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

مدثر نے کہا۔ "تم بے فکر رہو میں ابھی اُس کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ اُسے وہاں روکے رکھو میں پولیس بھجوا رہا ہوں۔"

"پولیس تو اُسے چھوڑ دے گی یار۔" شہزاد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"پولیس کے باپ کا راج ہے کیا؟" وہ بولا۔ "مُلک میں مارشل لا نافذ ہے۔ پولیس اُسے ہم سے پوچھے بغیر چھوڑنے کی غلطی نہیں کرے گی لیکن میں پھر بھی اپنے کمانڈنگ آفیسر سے بات کر لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔"

مدثر نے اُس سے گھر کا حال، علاقے کی خبریں اور چند اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر فرقان حیدر کے علاج سے علی کو محض وقتی افاقہ ہوا تھا، اس کے بعد اُسے دوبارہ وہی خواب تواتر سے دکھائی دینے لگے۔ میمونہ اور اس کی لڑائی روزانہ کا معمول بن گئی وہ ایک دوسرے پر چیختے چلاتے رہتے تھے۔ علی

بیوی کے سامنے لاکھ اپنی مجبوری بیان کرتا مگر میمونہ عورت تھی، وہ اپنی نسوانیت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اُن کی اس روز روز کی لڑائی نے آخرکار میمونہ کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ روٹھ کر اپنے میکہ گھر جا بیٹھی۔ علی نے کچھ روز تو بالکل اُس کی پرواہ نہ کی مگر پھر بیٹے کی محبت اُس کے غصے پر غالب آ گئی۔ چنانچہ ایک روز وہ شام کے وقت اپنے سسرال پہنچ گیا۔ دراصل آج وہ جو کچھ بھی تھا تو محض اپنے سسر کی وجہ سے تھا۔ جس کمپنی میں وہ ایم ڈی کے عہدے پر کام کر رہا تھا اُس کمپنی کے ستر فی صد شیئرز اُس کے سسر کے تھے اور جس عالی شان کوٹھی میں وہ رہتا تھا وہ میمونہ کو جہیز میں گفٹ کی گئی تھی۔ علی کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اُس کے سسر احتشام صاحب کا دیا ہوا تھا۔

احتشام صاحب اُس وقت گھر میں موجود نہیں تھے تاہم علی کی ساس نے اُس سے سرسری طور پر خیریت دریافت کرنے کے بعد اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور خود غائب ہو گئی۔ علی نے ساس کے رویے میں واضح تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ ساس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات بے سبب نہیں تھے یقیناً میمونہ نے اُس کے خلاف ماں کے کان بھرے تھے۔ علی کو بیٹھے کافی دیر گزر گئی تھی لیکن گھر کے کسی فرد نے بھی اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ اُس کے لیے بڑی ہتک آمیز بات تھی مگر وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد اُس کا سسر احتشام صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ احتراماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں یہاں قدم رکھنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' احتشام صاحب نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اُس کے تیور دیکھ کر پہلے تو علی کو حیرت ہوئی مگر پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ''انکل! میں میمونہ اور فیضان کو لینے کے لیے آیا ہوں۔''

''کس لیے... کون لگتے ہیں وہ تمہارے؟'' اُس نے بھڑک کر سوال کیا۔

''انکل! آپ کیسی بات کرتے ہیں؟'' وہ لبوں پر پھیکی سی ہنسی سجاتے ہوئے بولا۔ ''میمونہ میری بیوی ہے اور فیضان............''

''خاموش۔'' اُس نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ''وہ اب تمہارے کچھ نہیں لگتے.... سمجھے تم اور اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ ملازموں سے دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔''

''آپ زیادتی کر رہے ہیں انکل۔'' اُس نے احتجاج کیا۔ ''میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے ہوتے

رہتے ہیں لیکن رشتا ختم نہیں ہوتا۔"

"آج سے تم یہ رشتہ ختم سمجھو۔"

"کیوں ختم سمجھوں؟" اُسے بھی غصہ آگیا۔"وہ میری بیوی ہے، میرے بیٹے کی ماں ہے۔"

"بکواس مت کرو ورنہ پولیس کے حوالے کردوں گا۔" سسر نے دھمکی دی۔

"یہ رعب کسی اور کو دینا انکل! آپ اپنی بیٹی کو بے شک روک سکتے ہیں لیکن فیضان میرا بیٹا ہے اور میں اُسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"بہتر یہی ہوگا کہ یہاں سے باعزت طور پر لوٹ جاؤ، نہیں تو پچھتاؤ گے؟"

"بیٹے کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" اُس نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

"اوکے میں لے کر آتا ہوں۔" وہ ذومعنی انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

ڈرائنگ روم سے باہر آتے ہی اُس نے جیب سے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملا کر بولا "ایس پی جمشید! میں احتشام احمد بات کر رہا ہوں۔"

"حکم کیجیے جناب۔" ایس پی جمشید نے کہا۔"آج کیسے اس ناچیز کو یاد فرمایا۔"

"میرے داماد علی کو سبق سکھانا ہے۔"

"کیا کیا ہے اُس نے جناب؟"

"جمشید! کتا جب پاگل ہوجاتا ہے تو اپنے مالک پر غرانے لگتا ہے۔" وہ نخوت سے بولا۔"میرا داماد بننے سے پہلے وہ گندی نالی میں رینگنے والا ایک کیڑا تھا۔ میں نے اُسے فرش سے اُٹھا کر عرش تک پہنچادیا مگر آج اُس نے اپنی اوقات دکھادی۔ اُس کمینے نے میری میمونہ کو ٹارچر کیا ہے اور اب زبردستی اُسے اور میرے نواسے کو اُٹھانے کے لیے میرے گھر میں گھس آیا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب! میں ابھی اُس کا بندوبست کرتا ہوں۔" ایس پی جمشید نے جواب دیا۔

"دیر نہیں ہونی چاہیے میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا جناب۔"

”اوکے تھینکس۔“ کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا انکل۔“ معاً اسے عقب سے علی کی آواز سنائی دی۔ ”حقیقت حال جانے بغیر آپ نے اپنے گھر کے معاملے میں پولیس کو انوالو کر کے میرے اور میمونہ کے بیچ نفرت کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، واقعی اس کا انجام بہت بُرا ہوگا..... لیکن میمونہ کے نہیں بلکہ تمہارے حق میں بُرا ہوگا۔“

”میمونہ اور میں الگ الگ نہیں ہیں، میاں بیوی ہیں اور میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔“

”تیرے جیسے کسی بے وقوف نے بنائی ہوگی یہ مثال..... گاڑی کے دو نہیں چار پہیے ہوتے ہیں۔“

علی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ اسے غصے سے گھورنے لگا۔

”مجھے آنکھیں مت دکھاؤ، اب بھی وقت ہے بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ باقی کی زندگی شرمندگی بن کر رہ جائے گی۔“ اُس نے طنزیہ انداز میں مشورہ دیا۔

”بھاگتے مجرم ہیں، میں بھاگ کر آپ کا الزام سچ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔“ علی نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

”مطلب تم خوشی خوشی جیل کی ہوا کھانا چاہتے ہو؟“

”یہ بھول ہے آپ کی پولیس مجھے دو دن سے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکتی، میں کوئی لاوارث نہیں ہوں۔“

”لاوارث نہ ہوتے تو یوں میرے در پہ نہ پڑے ہوتے۔“

”میں اپنی محنت کی کمائی کھا رہا ہوں۔ آپ کی کمپنی مجھے گھر بیٹھے تنخواہ نہیں دیتی۔“ اس نے جواباً کہا اور پھر پلٹ کر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔

ابھی اسے بیٹھے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ڈرائنگ روم میں ایک انسپکٹر تین سپاہیوں کی معیت میں داخل ہوا اور اجڈ انداز میں بولا۔ ”اوئے علی تمہارا نام ہے کیا؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

''بلے بھئی بلے...... یہ تو کوئی فلمی ہیرو لگتا ہے۔'' انسپکٹر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔'' کیا ڈائیلاگ مارا ہے اس نے.....وہ لمبے والا........کیا نام ہے اُس کا؟''

''امیتابھ بچن سر۔'' ایک سپاہی نے جھٹ سے جواب دیا۔

''یہ بکواس کرتا ہے سر۔'' دوسرا سپاہی بولا۔'' یہ نانا پاٹکر کا ڈائیلاگ ہے، تین بار دیکھی ہے میں نے یہ فلم۔''

''فلم کے بچے! اس مامے کو گرفتار کرو۔'' انسپکٹر نے بگڑ کر حکم دیا۔

''کس جرم میں جناب؟'' علی نے نڈر انداز میں سوال کیا۔

''اوئے طیفے!'' انسپکٹر تیسرے سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔'' یہ ڈائیلاگ کس نے مارا تھا؟''

''سر! میں فلمیں نہیں دیکھتا۔''

''کیوں نہیں دیکھتے؟'' انسپکٹر نے اسے گھورا۔

''پولیس کی بے عزتی بہت کرتے ہیں سر۔'' سپاہی نے جواز پیش کیا۔

''ہاں سپاہیوں کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔'' انسپکٹر نے قہقہہ لگایا۔

''افسروں کی بھی کرتے ہیں سر۔'' اُس نے جواب دیا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا......تم تو فلمیں دیکھتے ہی نہیں ہو؟'' انسپکٹر نے اُسے گھورا۔

''مجھے منیر اور اقبال بتاتے ہیں سر۔'' اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔'' یہ روزانہ کیبل پر فلمیں دیکھتے ہیں۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے سر۔'' اُن دونوں نے یک زبان ہو کر تردید کی۔

''جھوٹ میں نہیں تم بولتے ہو۔'' لطیف عرف طیفا بپھر گیا۔'' کل ہی تو تم دونوں نے مجھے بتایا ہے کہ سنی دیول نے سلاخیں فلم میں ایک پولیس افسر کو تھانے کے اندر گھس کر خوب پٹخ پٹخ کر دھویا ہے اور پولیس افسر کتے کی طرح چیاؤں چیاؤں کرتے ہوئے ٹیبل کے نیچے گھس گیا۔''

''سر میں نے تو سلاخیں فلم دیکھی بھی نہیں ہے۔'' منیر چلایا۔'' اسے اقبال نے بتایا ہوگا۔''

''سر یہ بکواس کرتا ہے، میں نے تو پاکستانی سلاخیں دیکھی ہے۔ وہ پُرانی.....تیرے میرے پیار کا ایسا

ناتا ہے والی۔" اقبال نے اپنی صفائی پیش کی۔

"میں تھانے چل کر تم دونوں کو دکھاؤں گا سلاخیں اور تیرے میرے پیار کا ایسا ناتا ہے والا گانا بھی سناؤں گا۔" انسپکٹر نے اُنھیں گھورا اور پھر حکمیہ انداز میں بولا۔ "گرفتار کر لو اس ہیرو کو۔"

"کس لیے...... کیا کیا ہے میں نے؟" علی نے احتجاج کیا۔

"اوئے ہیرو! یہ سوال تھانے چل کر پوچھنا ورنہ ادھر ہی لمبا کر دوں گا۔" انسپکٹر نے دھمکی دی۔

وہ بولا۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔"

"اوئے طیفے، اوئے منیرے! یہ ہمیں اندھا کہہ رہا ہے۔ اسے ذرا اپنی زبان میں سمجھاؤ کہ قانون کس طرح اندھا ہوتا ہے؟" انسپکٹر نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور تینوں سپاہی علی پر یوں جھپٹے جیسے چیل مرغی کے چوزے پر۔ دو تین منٹ کے اندر ہی اُنھوں نے مار مار کر علی کا حلیہ بگاڑ دیا اور اُس کے تھری پیس سوٹ کو احمد اقبال صاحب والے "بھورے ماموں" کی لنگی بنا کر رکھ دیا۔

"بس اتنا کافی ہے۔" ذرا دیر کے بعد انسپکٹر نے مداخلت کی۔ "باقی کی کسر تھانے چل کر پوری کر لینا۔"

اس کے بعد اُنھوں نے علی کو ہتھکڑی لگائی اور تھانے کی طرف چل دیے۔ اس ساری کارروائی کے دوران گھر کے کسی فرد نے ڈرائنگ روم میں جھانکنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔



شمیر خان والے معاملے کے بعد نہ صرف سنبل بلکہ ماسٹر احمد کی نگاہوں میں بھی شہزاد کی عزت دو چند ہو گئی تھی۔ شہزاد نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے شمیر خان کو ہمیشہ کے لیے وہاں سے آؤٹ کر دیا تھا۔ ماسٹر احمد کے ذمہ شمیر خان کا ڈیڑھ لاکھ روپیا واجب الادا تھا جو شہزاد نے دو دنوں کے اندر چکا دیا تھا۔ شہزاد کے اس پُرخلوص عمل نے ماسٹر احمد اور اُس کے اہلِ خانہ کے دل جیت لیے تھے۔ خصوصاً سنبل تو بے حد خوش تھی۔ وہ شہزاد سے بہت محبت کرتی تھی، گو کہ شہزاد نے ابھی تک اُس سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا مگر وہ آنکھیں کی زبان سمجھتی تھی۔ شہزاد اُسے جس طرح میٹھی نگاہوں سے دیکھتا تھا اُس طرح اسے کبھی کسی مرد نے نہیں دیکھا تھا البتہ بعض رشتہ دار مرد اُس پر ہوس بھری نظریں ڈالنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اُن کی گندی نظروں اور شہزاد کی نظروں میں ایک

واضح فرق تھا، جسے وہ محسوس کر سکتی تھی۔

اُس دن صبح کے وقت وہ ذرا دیر سے ناشتا لے کر اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تو شہزاد بستر پر لیٹا ہوا تھا جب کہ جمال غائب تھا۔

''جمال بھائی کدھر ہے؟'' اُس نے ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔''زندگی میں پہلی بار وہ صبح کی سیر کرنے نکل گیا ہے۔''

''اور آپ کیوں نہیں گئے؟'' اُس نے ذومعنی انداز میں سوال کیا۔

''میں دیدارِ یار کا منتظر تھا۔اب ہو گیا ہے تو چلا جاؤں گا۔''

''دیدارِ یار.....کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟'' وہ بلا سوچے سمجھے پوچھ بیٹھی۔

''ہائے۔'' اُس نے ایک سرد آہ خارج کی۔''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔''

''آپ......آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں جی؟'' اُس کے رخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑنے لگی۔

''تم جو اتنی پیاری ہو جی، اس لیے۔'' شہزاد نے برجستہ جواب دیا۔

''اگر آپ ایسی باتیں کرتے رہیں گے تو پھر میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''رکو سنبل مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' شہزاد بستر سے اُتر کر اُس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں.....میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو بلا جھجک مجھے بتا دو.....میں تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔''

''مم.....مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جی۔'' اُس نے شرما کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

شہزاد کا دل چاہا کہ وہ خوشی سے ناچنا شروع کر دے مگر پھر اُس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔تاہم اُس نے گنگنانا ضرور شروع کر دیا تھا۔''محبوب میرے، محبوب میرے تُو ہے تو دنیا کتنی حسیں ہے......جو تُو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

وہ اپنی ہی دھن میں گنگنا رہا تھا کہ معاً جمال کمرے میں داخل ہوا اور اُسے گنگناتے دیکھ کر بولا۔''او بھائی! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔یہ بھدی آواز میں کس کو گانے سنائے جا رہے ہیں؟''

''مت پوچھ میرے یار آج میں کتنا خوش ہوں۔'' اُس نے پُر جوش انداز میں جواب دیا۔

''اوکے......نہیں پوچھتا۔''

''پوچھ پوچھ میرے یار۔''

''تو بتا ناں! کہ یہ گیت کس خوشی میں......''

''مت پوچھ میرے دوست۔'' اُس نے قطع کلامی کی۔

''ابے تُو ہوش میں تو ہے؟'' جمال جھنجھلا گیا۔ ''ناشتے میں چائے کی بجائے بھنگ تو نہیں چڑھا لی؟ جب پوچھتا ہوں تو کہتے ہو مت پوچھ اور جب نہیں پوچھتا تو کہتے ہو پوچھ پوچھ......تجھ پر کس جن کا سایا تو نہیں پڑ گیا۔''

''جن نہیں پری ہے پری اور وہ بھی پرستان کی۔''

''مجھے لگتا ہے تُو پاگل ہو گیا ہے۔'' جمال نے سر کھجایا۔ ''دنیا کے نقشے پر پرستان نامی ملک کہیں بھی موجود نہیں ہے۔''

''ملک بے شک موجود نہیں ہے لیکن پریاں تو موجود ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے؟''

''کیسے بتاؤں یار مجھے لفظ ہی نہیں مل رہے۔''

''اوکے۔'' وہ واپس پلٹا۔ ''مت بتاؤ میں سنبل سے پوچھ لیتا ہوں۔''

''رکو......بتاتا ہوں۔'' شہزاد نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''چل بتا......بات کیا ہے؟'' اُس نے واپس مڑتے ہوئے پوچھا۔

''سنبل مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ ابھی تمہارے آنے سے قبل اُس سے میری بات ہوئی ہے، وہ راضی ہے بس ماسٹر صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔''

''اوہ......تو یہ بات ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''لیکن ماسٹر صاحب سے بات کون کرے گا؟''

''تم کرو گے اور کون کرے گا؟''

''میرا ابھی خودکشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو، میں یہ احمقانہ قدم نہیں اُٹھا سکتا۔''

''دوست بن کر سوچو، دشمن بن کر نہیں۔''

''اوں ہوں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں انکل مُراد کا عتاب مول نہیں لے سکتا۔ میری طرف سے پکا انکار سمجھو۔''

''لعنت ہے تمہارے جیسے دوست پر۔''

''کوئی پرواہ نہیں...... تم جتنی بار چاہو مجھ پر لعنت بھیج سکتے ہو۔''

''میرے لیے نہ سہی، سنبل کے لیے ہی...........'' ایسے ہی وقت سنبل کی امی صفیہ بیگم اندر داخل ہوئی اور شہزاد کی بات ادھوری رہ گئی۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی؟'' صفیہ بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

''کک..... کچھ نہیں آنٹی...... بس ایسے ہی مذاق کر رہے تھے۔'' شہزاد نے بوکھلا کر جواب دیا۔

''یہ تم لوگوں نے ابھی تک ناشتا کیوں نہیں کیا؟'' وہ ناشتے والی ٹرے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''بس ابھی کرنے ہی والے تھے کہ آپ پہنچ گئیں۔''

''اب تو یہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔'' اُس نے آگے بڑھ کر ٹرے اُٹھالی۔ ''خیر کوئی بات نہیں میں دوبارہ گرم کر دیتی ہوں۔''

شہزاد بولا۔ ''رہنے دیں آنٹی..... بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''اس میں تکلیف والی کون سی بات ہے بیٹے! مائیں آخر کس لیے ہوتی ہیں؟''

''شکریہ آنٹی۔''

''کوئی بات نہیں، میں ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔'' وہ ٹرے اُٹھا کر چل دی۔

''اُس نے شاید ہماری باتیں سن لی ہیں؟'' جمال نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نو پرابلم جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟''

''تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی بے عزت کراؤ گے۔''

''فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' شہزاد نے اُسے تسلی دی۔ ''یہاں کے لوگ گھر

آئے مہمانوں کو بے عزت نہیں کرتے۔‘‘

’’میری چھٹی حس کہتی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے؟‘‘

’’چھٹی حس گدھوں کے پاس نہیں ہوتی،جینئس لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔‘‘شہزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی اثناء میں صفیہ بیگم ناشتا گرم کر کے لے آئی۔اُس نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی اور پھر شہزاد سے مخاطب ہو کر بولی۔’’بیٹے!ناشتا کرنے کے بعد اندر آجانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔‘‘

’’آجاؤں گا آنٹی۔‘‘شہزاد نے فرماں برداری سے جواب دیا اور صفیہ بیگم بغیر کچھ کہے واپس پلٹ گئی۔

☆......☆......☆

شہزاد اُس وقت صفیہ بیگم اور ماسٹر احمد کے سامنے سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ماسٹر احمد کو صفیہ بیگم نے فون کر کے بلوایا تھا۔صفیہ بیگم نے سنبل کے بارے میں اُن دونوں کی پوری گفتگو سُن لی تھی۔ چونکہ معاملہ بیٹی کا تھا اس لیے اُس نے شوہر کو بھی بلوا لیا تھا۔اُن دونوں میاں بیوی کو شہزاد اور اپنی بیٹی کی محبت پر کوئی اعتراض نہیں تھا تاہم وہ شہزاد کے باپ کی رضا مندی سے یہ رشتہ کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنی اس خواہش کا اظہار شہزاد کے سامنے کر دیا تھا۔شہزاد اب سر جھکائے انہی سوچوں میں مستغرق تھا جب کہ دونوں میاں بیوی جواب طلب انداز میں اُس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

’’انکل!‘‘قدرے توقف کے بعد شہزاد نے سر اُٹھایا۔’’بابا جان ایک روایتی جاگیردار ہیں وہ کبھی بھی میری بات نہیں مانیں گے۔‘‘

’’تو پھر ایسی صورت حال میں، میں کیا کر سکتا ہوں بیٹے!تمہارا باپ ایک جاگیردار ہے اور سچ پوچھو تو میں جاگیرداروں سے بہت ڈرتا ہوں۔اُس کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ کیسے ممکن ہے؟‘‘

’’انکل!میں بابا جان سے بات کر سکتا ہوں لیکن زبردستی اجازت طلب نہیں کر سکتا۔وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ہو سکتا ہے وہ بخوشی میری بات مان لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جرم میں مجھے عاق کر دیں۔‘‘شہزاد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

’’تم بات تو کرو.....ہو سکتا ہے وہ مان جائیں۔‘‘ماسٹر صاحب نے اصرار کیا۔

اُس وقت وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیلی فون اُن کے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ شہزاد نے ریسیور اُٹھایا اور اپنے گھر کا نمبر ڈائیل کر دیا۔ تیسری بیل کے بعد شہزاد کی سماعتوں سے اپنی ماں کی آواز ٹکرائی۔ ''ہیلو......کون؟''

''بے جی! کیسی ہیں آپ؟'' اُس نے فرماں برداری سے پوچھا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں......تم سناؤ کب واپس آ رہے ہو؟''

''بے جی! ابھی تو مجھے دس روز ہوئے ہیں، اتنی جلدی کیسے واپس آ سکتا ہوں؟''

''میرے لعل! میں نے واپسی کا پوچھا ہے یہ تو نہیں کہا کہ ابھی واپس آ جاؤ؟''

''بابا جان کہاں ہیں......مجھے اُن سے بات کرنی ہے؟'' اُس نے سوال کیا۔

''وہ تو ابھی ناشتا کرنے کے بعد اُٹھے ہیں۔ تم ہولڈ کرو میں دیکھتی ہوں شاید لان میں ٹہل رہے ہوں۔''

''ٹھیک ہے بے جی میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''ہیلو برخوردار!'' ذرا دیر کے بعد شہزاد کو اپنے باپ کی بارعب آواز سنائی دی۔ ''تم ٹھیک تو ہو ناں......کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟ میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں مزید رقم بھی جمع کرا دی ہے۔''

''بابا جان! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

''تو کرو ناں......میں سن رہا ہوں۔''

''مم......میں......میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کہاں......کس کے ساتھ؟'' مُراد علی نے اُلجھ کر پوچھا۔

جواب میں شہزاد نے بلا کم و کاست ساری صورت حال اُسے بتا دی۔

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ شہزاد کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ نہ جانے اُس کے بابا جان کس کیفیت سے گزر رہے تھے؟ فون پر وہ اُن کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

''تم فوراً بلکہ اسی وقت واپس آ جاؤ۔'' چند لمحوں کے بعد ریسیور میں سے مُراد علی کی تحکمانہ آواز اُبھری۔

”پلیز بابا جان! آپ ذرا ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچیں۔“ وہ منت کے انداز میں بولا۔” میں ماسٹر صاحب کو زبان دے چکا ہوں۔“

”میری اجازت کے بغیر تم نے یہ اہم فیصلہ کس طرح کرلیا؟“ وہ پھنکارا۔”لوٹ آؤ ورنہ بہت بُرا ہوگا۔“

”میں زبان سے نہیں پھر سکتا بابا جان۔“ اُس نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔”بھلے آپ مجھے جان سے ہی کیوں نہ مارڈالیں.....اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔“

”نافرمان بے ادب!“ مُر اد علی چلایا۔”اگر تم نے ایسا کچھ کیا تو میں تجھے عاق کردوں گا۔“

”کردیں بابا جان مگر میں پھر بھی آپ ہی کا بیٹا کہلاؤں گا۔“ اُس نے بغیر کسی ردِّعمل کے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔

”آج سے میں خود کو بے اولاد سمجھوں گا۔“ اتنا کہہ کر مُراد علی نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

”انکل! اب میں ایک عام آدمی ہوں۔“ وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے بولا۔”ابا حضور نے مجھے عاق کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔اب میں آپ کا فیصلہ سننے کا منتظر ہوں، چاہیں تو انکار کردیں یا پھر مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرلیں۔“

”فکر نہ کرو بیٹے! اللہ بہتر کرے گا۔“ ماسٹر احمد نے اُسے تسلی دی۔

اس واقعے کے ٹھیک پانچ دن کے بعد شہزاد اور سنبل کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام پاگئی۔شہزاد کی طرف سے جمال اور کیپٹن مدثر کے علاوہ کوئی بھی اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا تاہم ماسٹر احمد کے بہت سے رشتہ داروں نے شرکت کی تھی۔

☆......☆......☆

علی پر کوئی خاص کیس تو تھا نہیں چنانچہ دوسرے روز ہی ایک دوست نے بھاگ دوڑ کر کے عدالت سے اُس کی شخصی ضمانت کرالی تھی اور اب وہ اسی دوست کے ساتھ اُس کے گھر میں رہائش پذیر تھا۔سلیم نامی اُس کا وہ دوست نہایت ہی مخلص انسان تھا۔علی سے گھر بار، جاب، گاڑی اور بیوی بچہ سب کچھ چھن چکا تھا۔اب وہ ایک کنگال اور ناکارہ شخص تھا۔ایک ایسا شخص جس کے پاس سر چھپانے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔میمونہ پر تو وہ ویسے

ہی لعنت بھیج چکا تھا تاہم اپنے بیٹے فیضان کی یادوں نے اُسے تقریباً نیم پاگل کر دیا تھا۔ وہ دن رات بیٹے کی یاد میں تڑپتا رہتا تھا۔ سلیم حتی المقدور اُس کی دل جوئی میں لگا رہتا تھا مگر علی کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ دو تین بار سلیم نے اُسے بیٹے سے ملانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن احتشام صاحب ایک ارب پتی سرمایا دار ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھا۔ وہ دو بار صوبائی اسمبلی کی نشست جیت چکا تھا، گو کہ اُسے کبھی کوئی وزارت نہیں ملی تھی لیکن اپنی پارٹی میں اُسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ سلیم کو اُس نے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ واشگاف الفاظ میں دھمکایا بھی تھا کہ وہ آئندہ علی کا سفارشی بن کر نہ آئے ورنہ نتائج کا ذمہ دار خود ہوگا۔ سلیم جیسے امن پسند اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے شخص کے لیے یہ دھمکی کافی تھی۔

دوسری جانب خوابوں نے بھی ہنوز علی کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ متواتر وہی خواب دیکھتا رہتا تھا۔ سلیم اُس کی وجہ سے بہت پریشان رہا کرتا تھا مگر اُس کے پاس علی کی پریشانیوں اور غموں کا کوئی علاج اور مداوا نہیں تھا۔ ایک دن آفس میں سلیم نے اپنے ایک کولیگ سے علی کا مسئلہ بیان کیا تو وہ بولا۔ ''تمہارے دوست کی بیماری جسمانی نہیں ہے روحانی ہے۔ تم اُسے کسی ایسے بزرگ کے پاس لے جاؤ جو روحانی علاج کرتا ہو۔''

سلیم نے کہا۔ ''امجد یار میں تو کسی ایسے بزرگ کو نہیں جانتا۔ تمہاری نظر میں اگر ایسا کوئی شخص ہے تو مجھے بتاؤ، میں علی کو اُس کے پاس لے جاؤں گا۔''

''سید انوار شاہ کو جانتے ہو؟'' امجد نے استفسار کیا۔

''ہاں جانتا ہوں۔'' سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہی ناں! جس نے اسرار روحانیت پر چند کتابیں بھی لکھی ہیں؟''

''بالکل وہی، وہ لاہور میں رہتے ہیں۔ میں تجھے اُس کا ایڈریس اور سیل فون نمبر دے دیتا ہوں مگر جانے سے پہلے اُس سے ٹائم لے لینا وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔''

''فیس وغیرہ بھی لیتے ہوں گے؟''

''اوں ہوں۔'' امجد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ کسی سے ایک پیسا بھی نہیں لیتے، فی سبیل اللہ علاج کرتے ہیں۔ مریض کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو وہ کسی سے کچھ نہیں لیتے۔''

''دل نہیں مانتا یار! کہ اس دور میں بھی ایسے نیک لوگ موجود ہیں؟''

''دنیا اچھے اور نیک لوگوں سے کبھی خالی نہیں ہوگی۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ تم ایک بار اُن سے مل کر تو دیکھو، گرویدہ نہ ہوگئے تو میرا نام بدل دینا۔''

سلیم اُس دن گھر پہنچا تو لباس بدل کر سیدھا علی کے پاس جا بیٹھا، علی حسب معمول اپنے ہی خیالات میں مستغرق تھا اور اُسے ابھی تک سلیم کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

''علی!'' سلیم نے اُسے اپنائیت سے متوجہ کیا۔ ''تم اس قدر زندگی سے مایوس کیوں ہوگئے ہو.......اچھے بُرے دن تو آتے رہتے ہیں۔ آج غم تو کل خوشی، اسی کا نام تو زندگی ہے۔ مایوسی تو کفر ہے۔''

''پلیز سلیم!'' وہ گڑ گڑایا۔ ''صرف ایک بار.....صرف ایک بار مجھے میرے فیضان سے ملادو.....میں.....میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا.....میری آنکھیں ترس گئی ہیں اُسے دیکھنے کے لیے.....نجانے وہ کس حال میں ہوگا؟''

سلیم نے اُسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ''یہ میرے بس میں کہاں ہے میرے دوست؟.....تمہارا سسر بہت ظالم شخص ہے اُسے کسی پر رحم نہیں آتا۔ پتا نہیں ایسے لوگوں کے پہلو میں دل بھی ہوتا ہے یا نہیں؟''

''میں اپنے بیٹے کے بغیر نہیں جی سکتا سلیم۔'' اُس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''اللہ پر بھروسا رکھو دوست! اُس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔'' سلیم نے اُسے تسلی دی۔ ''تمہارے دن ضرور پھریں گے۔''

''کب پھریں گے؟.....جب میں سسک سسک کر مرجاؤں گا؟''

''اللہ سے شکوہ نہیں کیا جاتا میرے دوست! اُس کا فرمان ہے کہ مجھے چپکے چپکے اور گڑگڑا کر پکارو۔ جب تم انسانوں کی بجائے اللہ کے سامنے دامن پھیلاؤ گے تو وہ تجھے مایوس نہیں کرے گا۔ بس شرط خلوصِ نیت کی ہے، اُسے زبان سے نہیں دل سے پکارو وہ سب کی سنتا ہے، تمہاری بھی ضرور سنے گا۔''

وہ چپ ہوگیا، پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں کب تک تم پر بوجھ بنا رہوں گا۔ میرے لیے اگر کسی چھوٹی موٹی جاب کا بندوبست ہوجاتا تو.........''

”تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو۔“ سلیم نے قطع کلامی کی۔ ”تم تو میرے محسن ہو، تمہاری ہی وجہ سے آج میں اتنی اہم پوسٹ پر کام کر رہا ہوں......پلیز دوبارہ ایسی بات کبھی مت کرنا ورنہ مجھے دُکھ ہوگا۔“

”اوکے دوست نہیں کروں گا لیکن.........“

”لیکن ویکن چھوڑو۔“ سلیم نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ”ہم دونوں کل صبح لاہور جا رہے ہیں۔ میں نے آفس سے تین دنوں کی رخصت لے لی ہے۔“

”لاہور جا کر کیا کریں گے؟“

”بس ایسے ہی سیر و تفریح کریں گے۔“ سلیم نے اصل بات چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”مطلب فضول خرچی کریں گے؟“

”اس میں فضول خرچی کہاں سے آ گئی یار......وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے، اُس نے بلایا ہے۔“

”تو پھر میری کیا ضرورت ہے؟“ اُس نے پوچھا۔ ”تم خود چلے جاؤ۔“

”اُس نے میرے ساتھ تمہیں بھی دعوت دی ہے۔“ سلیم نے پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔

”مجھے وہ کیسے جانتا ہے؟“

”میں اُس سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا چکا ہوں اور وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔“

”کیوں.....کس لیے؟“ وہ اُلجھ گیا۔

”وہ خوابوں کی تعبیر کا علم جانتا ہے۔“ سلیم سچ بولنے پر مجبور ہو گیا۔ ”تمہیں اُس سے ضرور ملنا چاہیے۔“

”چھوڑو یار! ایسے ہی کوئی ڈھونگی ہوگا۔ بے کار میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تم نے ”لکھ تھلے پہاڑ“ والی کہاوت سنی ہے کبھی؟ سلیم نے سوال کیا۔

”ہاں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”نہ صرف سنی ہے بلکہ اس کا مطلب بھی اچھی طرح جانتا ہوں اور یہ سرائیکی زبان کی کہاوت ہے۔“

”تو بس ٹھیک ہے ہم بھی یہی آس لے کر لاہور جائیں گے۔“ سلیم نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

☆......☆......☆

وہ ایک محل نما کوٹھی تھی اور شہزاد علی وہاں گزشتہ پانچ برس سے تنہا زندگی بسر کر رہا تھا۔ سنبل سے شادی کرنے کے بعد اُس کے باپ نے واقعی اُسے عاق کر دیا تھا مگر باپ کی وفات کے بعد سب کچھ اُسے با آسانی واپس مل گیا تھا۔ باپ کی زندگی میں اُس نے کبھی اُس کوٹھی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اُس نے بائیس برس کا طویل عرصہ جمال کے ہاں شہر میں بسر کیا تھا۔ شادی کے بعد سنبل نے صرف دو برس ہی اُس کا ساتھ دیا تھا۔ سنبل کی موت میٹرنٹی ہوم میں ہوئی تھی۔ پہلے بچے کی ڈیلیوری کے دوران ہی وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ شہزاد کو سنبل کے ساتھ وہ آخری ملاقات اب تک یاد تھی۔ سنبل کے آخری الفاظ اب تک اُس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ اُس نے نہایت ہی بے بسی کے عالم میں شہزاد سے ایک ایسی التجا کی تھی جس کی سزا آج بھی شہزاد بھگت رہا تھا۔ سنبل نے نزع کے عالم میں اُس سے التجا کی تھی۔ ''شہ.....زاد.....مم.....میرے مرنے.....کے بعد.....دو.....سری.....شا.....دی.....مت.....کرنا.....میرے.....بچے.....کو.....ماں.....اور.....باپ.....دونوں.....کا.....پیار دینا.....میرے.....حصے کی وفا.....اور پیار.....میرے بچے.....کو دینا.......''

سنبل کے مرنے کے بعد شہزاد نے خود کو نومولود بیٹے کی دیکھ بھال کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے فیڈر کے ذریعے مصنوعی دودھ پلاتا تھا۔ اُسے نہلاتا تھا۔ اُس کی غلاظت صاف کرتا تھا۔ اُس کی راتوں اور دن کا چین لٹ گیا تھا مگر وہ کبھی بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا تھا۔ عشق میں جان دینا آسان ہے لیکن کسی کے ہاتھ میں زندگی کی ڈور تھمانا مشکل ترین کام ہے۔ لوگ زندوں سے کیے گئے وعدے ایفا نہیں کرتے اور وہ ایک مری ہوئی عورت سے کیا گیا عہد نبھا رہا تھا۔ اُسے ننھے عدنان میں اپنی سنبل کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ وہ پانچ سال تک عدنان کی آیا بنا رہا، یہ عرصہ اُس پر بہت کٹھن گزرا مگر جب عدنان نے اسکول جانا شروع کیا تو اُس نے بھی ایک فرم میں جاب کر لی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے دوست جمال پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ جاب ملتے ہی اُس نے دو کمروں کا ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا اور پھر دو سال کے عرصے میں وہ اُس فلیٹ کا مالک بن چکا تھا۔

جمال جب کبھی بھی اُس سے ملنے کے لیے آتا تھا تو اُسے شادی کرنے کا مشورہ ضرور دیا کرتا تھا، جب کہ وہ ہر بار جمال سے یہی کہتا تھا کہ وہ سنبل سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ تب جمال اُسے سمجھاتا کہ عورت کے بغیر گھر گھر

نہیں ہوتا بلکہ قبرستان ہوتا ہے لیکن وہ جمال کو بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا کرتا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا اور شہزاد کی جوانی ادھیڑ عمری میں ڈھل گئی۔ جس روز عدنان نے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی اُس روز شہزاد کی خوشی قابلِ دید تھی۔ اس خوشی کو انجوائے کرنے کے لیے اُس نے جمال کی پوری فیملی کو کھانے پر انوائیٹ کرلیا۔ اس دعوت کا اہتمام شہر کے مہنگے ترین فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں کیا گیا۔ اُس روز شہزاد نے خوب دل کھول کر خرچ کیا تھا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عدنان نے کچھ عرصہ تو آرام کیا اور پھر جاب کی تلاش میں دفاتر کے چکر لگانے لگا۔ جلد ہی اُسے ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی۔ دو ماہ کے بعد کمپنی کے مالک کی اکلوتی بیٹی کا عدنان پر دل آگیا مگر کمپنی کے مالک کو اُن کی یہ محبت بہت ناگوار گزری۔ اُس نے پہلے پہل تو بیٹی کو پیار سے سمجھایا، پھر غصہ دکھایا لیکن جب بیٹی کسی صورت نہ مانی تو اُس نے بیٹی کے سامنے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ عدنان کو یہ شادی کرنے کے لیے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اُس قتالہ عالم نے جب عدنان پر زور دیا تو وہ گھر چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ اُسی روز آفس سے واپس آنے کے بعد جب اُس نے شہزاد سے اس سلسلے میں بات کی تو شہزاد کو اپنی سماعتوں پر بالکل یقین نہ آیا۔

''تم......تم ایک لڑکی کی خاطر اپنے باپ کو چھوڑنے کی بات کر رہے ہو؟'' اُس نے حیرانی اور دُکھ کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

''ابو! میں اُس سے بہت پیار کرتا ہوں۔'' عدنان نے کہا۔ ''اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں مرجاؤں گا۔''

''میں نے تجھے شادی کرنے سے کب منع کیا ہے؟......بے شک شادی کرو لیکن گھر چھوڑنے کی بات مت کرو بیٹے! میں بھی تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔''

''ابو! یہ میری ہونے والی بیوی کی خواہش ہے ورنہ میں تو آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔''

''واہ بیٹے واہ۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم نے ایک لڑکی کی خواہش پر اُس باپ کو قربان کر دیا جس نے تجھے ماں بن کر پالا، جس نے اپنی جوانی تجھ پر وار دی، جو سرما کی لمبی راتیں محض اس لیے جاگ جاگ کر گزارتا رہا کہ تیری نیند نہ ٹوٹے۔ تیری ماں نے تو صرف تجھے جنم دیا تھا باقی سب کچھ تو اس باپ نے کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں

سے تیری غلاظت صاف کی ہے، تجھے لوریاں سنائی ہیں۔ ارے! میں نے کیا کچھ نہیں کیا تیری خاطر..... یقین نہیں آتا تو جا کر انکل جمال سے پوچھ؟..... میں نے صرف باپ کا نہیں ماں کا فرض بھی نبھایا ہے۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے آپ کی مہربانیوں اور محبت سے؟" وہ قدرے شرمسار انداز میں بولا۔ "شادی کرنے کے بعد میں اُن لوگوں کو منا لوں گا، بس دو تین ماہ کے لیے آپ کو اکیلے رہنا پڑے گا، اس کے بعد میں آپ کو یہاں سے.........."

"لوگ بیٹیوں کو بیاہ کر رخصت کرتے ہیں۔" اُس نے قطع کلامی کی۔ "اور تم مجھے بیٹے کو رخصت کرنے کا مشورہ دے رہے ہو...... تجھے باپ کی عزت و وقار کا کچھ بھی احساس نہیں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ صرف باتیں کرتے ہیں ابو! میں اور آپ تو کیا وہ تو معاذ اللہ نبیوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔"

"تم جب فیصلہ کر چکے ہو تو پھر مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے ورنہ آپ سے اجازت کیوں مانگتا؟...... چپ چاپ شادی کر لیتا۔"

"اوکے..... اگر یہ بات ہے تو پھر میں اجازت نہیں دے سکتا۔" شہزاد نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"پلیز ابو پلیز....." وہ گڑگڑایا۔ "یہ میری زندگی کا سوال ہے۔"

"میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اگر تجھے منظور نہیں ہے تو پھر جاؤ...... جو دل چاہے وہی کرو۔"

دوسرے دن عدنان آفس گیا تو پھر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ باپ کی محبت پر اُس نے اپنے شان دار مستقبل کو ترجیح دی تھی۔ عدنان کے گھر چھوڑ کر جانے کے تقریباً دو ماہ بعد شہزاد کے والد فوت ہو گئے اور شہزاد شہر والا فلیٹ بیچ کر گاؤں چلا گیا، جہاں اُس کی ماں اکیلی رہ گئی تھی مگر چھ ماہ کے بعد اُس کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اب شہزاد دس کنال پر بنی ہوئی وسیع و عریض اور شان دار کوٹھی میں تنہا رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

سید انور شاہ اُس وقت اپنی نشست گاہ میں چند لوگوں کے بیچ بیٹھے ایک خاص موضوع پر نہایت دھیمے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ فرشی نشست تھی، دبیز کارپٹ پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے مگر حاضرین میں سے کسی نے بھی تکیے کے ساتھ ٹیک نہیں لگائی ہوئی تھی۔ سلیم اور علی ایک ملازم کی رہنمائی میں نشست گاہ میں داخل ہوئے

اور سلام کرنے کے بعد خاموشی کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئے۔ سید انوار شاہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ اُن کے سرخ و سپید چہرے پر سیاہ گھنی ڈاڑھی بہت جچ رہی تھی۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر تو حقوق العباد اور حقوق اللہ پر قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی اور پھر اصل موضوع یعنی روحانیت کے متعلق حاضرین کو بتانے لگے۔

''روحانیت کیا ہے؟'' وہ دھیمے مگر پُرتاثیر انداز میں بولے۔ ''یہ خالق اور تخلیق یعنی انسان اور اللہ رب العزت کے درمیان ایک پل صراط کی طرح ہے، اس پل صراط سے گزرے بغیر کوئی انسان خالق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس راہ کو پل صراط سے تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ سفر کے تعین کے لیے راستے کا معلوم ہونا شرطِ اول ہے جب کہ اس کٹھن اور دشوار راہ پر چلنے کے لیے ظاہر کی بجائے باطنی آنکھ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ چشمِ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ چشمِ بینا کا لفظی مطلب ہوتا ہے دیکھنے والی آنکھ جو انسان کے ساتھ ساتھ دوسری مخلوقات کے پاس بھی ہیں مگر یہاں چشمِ بینا سے مُراد وہ آنکھ ہے جو ظاہر کی بجائے باطن کو دیکھ سکے۔ روحانیت کے سفر میں پہلی منزل راستے کا بھائی دینا ہے، سو جو آنکھ اللہ کے نُور سے نہیں دیکھ سکتی اُس آنکھ کو یہ راستا بھائی نہیں دیتا۔ اس کے بعد سفر کا آغاز ہوتا ہے جو پہلی منزل سے بھی زیادہ دشوار گزار اور کٹھن ہوتا ہے کیوں کہ اس سفر میں انسانی نفس شب و روز اُس کی روح کو مغلوب کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرتا رہتا ہے۔ جو مغلوب ہو جاتے ہیں وہ راستے کی دھول بن جاتے ہیں لہٰذا سفر کے آغاز ہی میں نفس کو شکست دینا ضروری ہوتا ہے ورنہ سالک کے گمراہ ہو جانے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ نفس کے وار سے بچنے کے لیے تزکیہ کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ آپ حضرات اس بات کو بھی نگاہ میں رکھیں کہ روحانیت کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا دین سے نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی اُس فطری لگن کی جانب اشارہ کرتی ہے جو ابد سے انسان میں موجزن ہے۔ اس بات کو بھی اپنے ذہن میں رکھیں کہ محض علم کی معراج انسان کو یہ منزل طے کرانے سے قاصر رہتی ہے کیوں کہ علم کی انتہا انسان کو صرف مقامِ حیرت تک لے جا سکتی ہے تب انسان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اُس کے اندر کی جہالت اور لاعلمی کس کمیت اور مقدار کے ساتھ موجود ہے۔ اندر کے علم کے بغیر روحانیت کا پل صراط عبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے واقعہ

سے لی جاسکتی ہے۔قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ اور خضرؑ کی ملاقات مقام ''مجمع البحرین'' پر ہوئی تھی۔ چنانچہ ظاہر بین علماء نے ایسے سمندری مقامات کی تلاش شروع کر دی جہاں پر دو سمندر یا دریا ملتے ہوں، وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے؟.....لیکن علامہ بیضاویؒ نے صحیح مقام کی جانب رہنمائی فرمادی کہ ''مجمع البحرین'' سے مُراد علم کے دو سمندر ہیں۔ایک ظاہری علوم کا سمندر اور دوسرا باطنی علوم کا سمندر، خضرؑ باطنی علوم کا سمندر تھے جب کہ موسیٰ ظاہری علوم کا۔لہٰذا موسیٰ ہر مقام پر خضرؑ کو ٹوکتے رہے جب کہ خضرؑ اندر کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔اس واقعہ میں انسانوں کے لیے بہت سے نصائح اور اسباق ہیں۔ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والا چاہے وہ کتنی ہی عظیم درس گاہوں سے فارغ التحصیل کیوں نہ ہوا ہو اُس وقت تک حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا جب تک وہ تزکیہ کی منازل طے نہ کرلے۔بس آج کے لیے اتنا کافی ہے، باقی ان شاء اللہ کل۔''

حاضرین جو اُن کی گفتگو سن کر مسحور بیٹھے تھے۔سلیم اور علی کو اُن کا خاص مہمان سمجھ کر وہاں سے رخصت ہونے لگے۔جب علی اور سلیم کے علاوہ تمام لوگ رخصت ہوگئے تو سید انوار شاہ اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔

تعارف کے بعد سلیم نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''شاہ صاحب! یہ میرے انتہائی عزیز دوست ہیں مگر آج کل گوناگوں مسائل کا شکار ہیں۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔'' شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا۔''تکلیفیں اور مسائل بے سبب نہیں آتے، ان کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔''

''شاہ جی! ہم بڑی اُمید لے کر آپ کے آستانے پر آئے ہیں، میرے دوست پر بھی مہربانی فرمائیے گا۔''

''دُکھ اور مصیبتیں ٹالنا مخلوق کے نہیں خالق کے دستِ قدرت میں ہوتا ہے، انسان تو محض وسیلہ بن سکتا ہے اور وہ بھی اللہ چاہے تو تب ورنہ اُس کی منشاء کے خلاف تو ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔'' اتنا کہہ کر وہ علی کی طرف متوجہ ہوگئے۔''کیا نام ہے میاں؟''

''علی۔''

''پورا نام کیا ہے؟''

''عدنان شہزاد علی۔''

”ماں کا نام؟“

”سنبل۔“

”مسئلہ؟“

اُن کے اس سوال پر علی نے لمحہ بھر کے لیے چپ سادھ لی اور پھر خوابوں سے لے کر بیوی اور بچے کی جدائی تک سب کہانی بیان کر دی۔

”میرے قریب آ کر بیٹھو۔“ شاہ صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

علی اُٹھ کر اُن کے سامنے جا بیٹھا۔ تب شاہ صاحب نے باری باری اُس کی ہتھیلیاں دیکھیں۔ روحانیت کے ساتھ ساتھ اُنھیں پامسٹری پر بھی دسترس حاصل تھی۔ جب وہ اچھی طرح علی کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس کی فیس ریڈنگ بھی کر چکے تو بولے۔ ”تمہاری ماں تمھیں جنم دے کر فوراً فوت ہو گئی تھی ناں؟“

علی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”آپ...... آپ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟“ اُس نے تحیر کے عالم میں سوال کیا۔

”جو میں نے پوچھا ہے اُس کا جواب دو؟“ شاہ صاحب نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”غیر ضروری سوالات مت کرو۔“

”جی ہاں فوت ہو گئی تھی۔“

شاہ صاحب بولے۔ ”اس کے بعد تمہارے والد نے تمھیں ماں بن کر پالا، اُس نے تمہاری خاطر ہر وہ کام سرانجام دیا جو ایک عورت کو ہی زیب دیتا ہے۔ نومولود بچے کو پالنا دنیا کا دشوار ترین کام ہے اور یہ صرف ایک ماں ہی سرانجام دے سکتی ہے، اسی لیے تو جنت ماں کے قدموں تلے بتائی گئی ہے۔ تم پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص کرم کیا تھا اور اُس کا یہ کرم اب تک جاری ہے۔ تم گناہ پر گناہ کرتے گئے مگر اُس رحیم ذات نے ہمیشہ تم سے صَرفِ نظر کیا۔ سب سے پہلے تم نے ایک عورت کی خاطر اُس باپ کو چھوڑ دیا جس نے تمہاری خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اس گناہ پر قدرت تمھیں کڑی سے کڑی سزا دے سکتی تھی مگر ایسا نہ ہوا تو محض تمہارے مہربان باپ کی دعاؤں کے سبب سے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تجھے خوابوں کے ذریعے صراطِ مستقیم دکھایا مگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ خوابوں میں آنے والی عورت کوئی اور نہیں تمہاری ماں ہے۔ تم دنیا کے بدبخت ترین انسان ہو جو جنم

دینے والی ماں کو بھی نہ پہچان سکے حالانکہ تم نے بچپن میں اپنی ماں کی تصویر متعدد بار دیکھی تھی۔ وہ خوابوں میں تم سے اس لیے نہیں بولتی کیونکہ تم نے باپ کا دل توڑا ہے...... ماں تم سے سخت ناراض ہے۔ خواب انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں مگر تم نے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ان خوابوں کو بیماری سے تعبیر کیا تو تب ذاتِ باری تعالیٰ نے تجھ پر مکافاتِ عمل نازل فرمائی، بزرگ کہتے ہیں کہ اگر انسان سمجھے تو مکافاتِ عمل بھی دراصل خدائے بزرگ و برتر کی اپنے بندوں پر ایک خاص مہربانی ہوتی ہے ورنہ آخرت کی سزا تو بہت کڑی ہے، کون برداشت کرسکتا ہے؟ سو جن پر اللہ مہربان ہوتا ہے اُنھیں اُن کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں دے کر آخرت کے عذاب سے نجات دلا دیتا ہے۔ مکافاتِ عمل کیا ہے؟...... گناہ گار کو اس کے گناہوں کا احساس دلاتا ہے اور اس میں دوسرے انسانوں کے لیے عبرت کا سامان بھی ہوتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ جو بونے والا گندم نہیں کاٹ سکتا...... نیم کے پیڑ پر آم نہیں لگتے...... تم نے ایک باپ سے بیٹا چھینا تو بدلے میں قدرت نے تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا تاکہ تمھیں تمہارے گناہ کا احساس دلایا جاسکے..... اب بھی اگر تم نہ سمجھے تو یاد رکھو دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی گنوا بیٹھو گے۔''

لفظ کیا تھے...... زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔ وہ رو دیا۔ سلیم کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ شاہ صاحب نے اُسے رونے دیا کہ یہ ندامت کے آنسو تھے۔ وہ عرقِ انفعال تھا جسے شانِ کریمی موتی سمجھ کر چُن لیتی ہے۔ اُس کی قہاری غفاری میں بدل جاتی ہے اور رحمت جوش میں آکر گناہ گار کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ جب وہ خوب رو چکا تو شاہ صاحب انتہائی شفقت آمیز انداز میں بولے۔'' جاؤ رب کو راضی کرنا ہے تو پہلے باپ کو راضی کرو..... پھر دیکھنا قدرت تم پر کس طرح مہربان ہوتی ہے؟''

''ہاں شاہ جی۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔'' میں واقعی بدبخت ہوں۔ میرے لیے خصوصی دعا فرمائیں کہ میں اپنے باپ کی مہربانیوں اور شفقت کا حق ادا کرسکوں۔ پتا نہیں اللہ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں؟''

''اُس کی بارگاہ میں جب کوئی انسان ندامت اور پشیمانی کے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا ہے تو وہ رحیم ذات کبھی اُسے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔''

''میرا گناہ بہت بڑا ہے شاید........''

''اُس کی رحمت سے کچھ بھی بڑا نہیں ہے۔'' شاہ جی نے قطع کلامی کی اور پھر باری باری اُن سے معانقہ کرنے کے بعد اُنھیں رخصت کر دیا۔

☆......☆......☆

اُس دن جب وہ صبح سویرے جاگا تو بے حد پریشان تھا۔ سنبل کو گزشتہ رات اُس نے پہلی بار خواب میں دیکھا تھا۔ خواب میں سنبل اُسے بار بار عدنان کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہی تھی۔ وہ عدنان کے متعلق بے حد متفکر تھی۔

''تو کیا عدنان واقعی کسی مصیبت میں گرفتار ہے؟'' یہ وہ سوال تھا جو جاگتے ہی اُس کے ذہن میں گونجا تھا، مگر اس سوال کا جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ عدنان کو گھر سے نکلے پانچ برس بیت چکے تھے اور ان پانچ برسوں کے اندر اُس نے ایک بار بھی باپ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ عدنان اس قدر کٹھور اور سنگدل نکلے گا یہ شہزاد نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ اُس نے شہزاد کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا تھا۔ وہ چاہتا تو سنبل کے مرنے کے بعد کسی اُونچے خاندان کی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ اُس کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اپنی محبوب بیوی سے کیا ہوا عہد اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اس عہد کو نبھاتے نبھاتے آج وہ رہگزر زیست پر تنہا رہ گیا تھا۔ جمال کے علاوہ کوئی بھی اُس کا ہمدرد اور ساتھی نہیں رہا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں جمال اُس کا واحد غم گسار تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے اُس کا ذہن انہی خیالات میں اُلجھا رہا۔ آخر کار وہ عدنان کو ڈھونڈنے کا تہیہ کر کے قدرے مطمئن ہو گیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے چند گھریلو کام نمٹائے اور پھر سیل فون نکال کر جمال کو کال کرنے لگا مگر جمال کا سیل فون آف تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اُس نے دوبارہ ٹرائی کیا لیکن جمال کا سیل فون بدستور آف تھا۔ وہ جھنجلا گیا اور خود کلامی کے انداز میں جمال کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ ''پتا نہیں یہ کہاں مر گیا ہے؟ کم از کم اس گدھے کو سیل فون تو آن رکھنا چاہیے تھا۔ بوڑھا ہو گیا ہے مگر اس بد بخت کو ابھی تک عقل نہیں آئی، اُلو کا اُلو ہی رہا۔''

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اُس نے تیسری بار جمال کا نمبر ٹرائی کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں باہر نکلا اور سیدھا پورچ کا رُخ کیا جہاں اُس کی نیو چمچماتی ہوئی بی ایم ڈبلیو گاڑی موجود تھی۔ یہ گاڑی اُس نے دو ماہ قبل ہی باہر سے منگوائی تھی۔ اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی، ریورس گیئر لگایا اور پورچ سے باہر

آ گیا۔اب اُس کا رُخ کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف تھا۔گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اُس نے گاڑی روک دی۔وہ نیچے اُترا اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ایسے ہی وقت ڈور بیل بج اُٹھی۔اُس نے گیٹ کھولا تو سامنے جمال موجود تھا۔

''تم اور یہاں؟''اُس نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔

''کیوں....''جمال مسکرایا۔''کیا میرے یہاں آنے پر پابندی ہے؟''

''گدھے!میں تین بار تجھے کال کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔تیرا سیل فون کہاں ہے؟''

''وہ تو اب تک چور بازار میں پہنچ چکا ہوگا.....بلکہ ہو سکتا ہے اب تک بک بھی چکا ہو۔''

''اوہ آئی سی۔''اُس نے افسوس کا اظہار کیا۔''میں بلاوجہ تجھے گالیاں دیتا رہا۔''

''تیری گالیوں کا میں نے کب بُرا منایا ہے یار؟''جمال اُس سے گلے ملتے ہوئے بولا۔''مجھے پتا ہے تیری گالیوں میں بھی پیار ہوتا ہے۔''

''چل چھوڑ زیادہ مسکہ مت لگا۔''اُس نے جمال سے الگ ہوتے جواب دیا اور پھر عین اسی لمحے اُس کی نظر جمال کی گاڑی میں موجود اشخاص پر پڑی تو جیسے وہ پل بھر کے لیے پتھر کا بن کر رہ گیا۔گاڑی میں اُس کا اور سنبل کا عدنان کسی اجنبی نوجوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔عدنان کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔باپ بیٹے کی نگاہیں ملیں تو وقت جیسے ٹھہر سا گیا دونوں پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے دیکھ رہے تھے۔اُن کی نگاہوں میں جیسے صدیوں کی پیاس تھی۔وہ پورے پانچ برس کے بعد ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

''عد......نان......''شہزاد کے ہونٹ لرزے اور پھر اُس کی آواز بھرا گئی کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ بول پایا تاہم اُس کی آنکھیں ضرور برسنے لگی تھیں۔

عدنان کی کیفیت بھی اُس سے مختلف نہیں تھی۔برسوں بعد اپنے باپ کو سامنے دیکھ کر اُس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں مگر اُس نے گاڑی سے باہر پاؤں رکھنے کی ہمت نہ کی اُسے ڈر تھا کہ باپ اُسے دھتکار دے گا۔

''جاؤ علی۔''سلیم نے اُسے ٹھوکا لگایا۔''انکل کے قدموں میں گر جاؤ۔''

''کس منہ سے جاؤں سلیم۔''وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔''کیسے ابو کا سامنا کروں......مم....میں نے

اُن کے ساتھ بہت بُرا کیا ہے.....کاش.....میں نے ایسا نہ کیا ہوتا......کاش اُس وقت......"

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" سلیم نے اُسے ٹوک دیا۔"جاؤ انکل تجھے گلے لگانے کے لیے بے چین نظر آرہے ہیں۔"

ایسے ہی وقت شہزاد گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔عدنان نے تیزی سے گاڑی کی کھڑکی کھولی، نیچے اُترا اور بھاگتا ہوا باپ کے قدموں میں گر گیا۔

"مم مجھے.....معاف کردیں ابو.......معاف کردیں.....میں بہت گناہ گار ہوں۔" اُس نے روتی ہوئی آواز میں التجا کی۔"اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا.....تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

شہزاد جھکا اور اُسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔"باپ کے گلے نہیں لگو گے؟"

وہ "ابو" کہتے ہوئے باپ سے لپٹ گیا۔دونوں کچھ کہنے کے بجائے بس روئے جارہے تھے شاید لفظوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔باپ بیٹے کا یہ ملن دیکھ کر جمال اور سلیم کی آنکھوں میں بھی پانی اُتر آیا تھا۔جب جذبات کا طوفان تھم گیا تو دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔تب جمال کھنکار کر بولا۔"یہ ٹریجڈی سین ختم کرو یار! میں بھوک سے مرا جارہا ہوں کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو،تم دونوں تو بس روئے جارہے ہو۔"

شہزاد اپنی بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولا۔"بس ہمیشہ کھانے کے پیچھے ہی پڑے رہنا،ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے اور تمہارے پیٹ میں مروڑ اُٹھنا شروع ہوگئے۔"

دونوں بوڑھے ہوگئے تھے مگر اُن کی نوک جھونک اسی طرح چلتی رہتی تھی۔اب بھی وہ ٹین ایجرز کی طرح ایک دوسرے کو مخاطب کیا کرتے تھے۔

☆......☆......☆

"تمہاری بیوی تو ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" کھانے سے فراغت کے بعد شہزاد نے عدنان سے پوچھا۔

"وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے ابو" وہ نادم انداز میں بولا۔"اور.....اور.......آپ کے پوتے کو بھی ساتھ لے گئی ہے۔"

''کیوں......کس لیے؟'' شہزاد نے سوال کیا۔

عدنان کا سر جھک گیا تاہم اُس نے ساری رام کتھا وضاحت کے ساتھ بیان کر دی۔

''میں ملک احتشام کو چھوڑوں گا نہیں۔'' شہزاد کے جاگیردارانہ لہو نے جوش مارا۔''اُس کی اوقات ہی کیا ہے......میں اُس کا وہ حشر کروں گا کہ وہ مرتے دم تک یاد رکھے گا، جس کمپنی سے اُس نے تمہیں نکالا ہے میں وہ کمپنی ہی خرید لوں گا......بلکہ اُس کا سب کچھ خرید کر اُسے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دوں گا۔''

''نہیں ابو!'' عدنان نے انکار میں سر ہلایا۔''آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ جو کچھ بھی ہیں میرے سسر ہیں اور سسر باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ میں نے برسوں پہلے ایک باپ کا دل توڑا تھا جس کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں......اب مجھ میں ایک اور باپ کا دل توڑنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں نے اپنا فیصلہ اُس منصفِ اعلیٰ پر چھوڑ دیا ہے جس کی عدالت میں رشوت، سفارش اور مرتبہ نہیں چلتا، وہاں صرف انصاف ہوتا ہے اور میرا ایمان ہے کہ میرے ساتھ بھی انصاف ہوگا۔''

''یہ......یہ تم کہہ رہے ہو؟'' اُسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا تو حیرت سے بیٹے کی شکل دیکھنے لگا۔

''ہاں ابو......اور مجھے آپ سے بھی یہی اُمید ہے۔'' عدنان نے جواب دیا۔

جمال اور سلیم نے بھی عدنان کے اس فیصلے کی نہ صرف تائید کی بلکہ اُسے سراہا بھی۔

''ٹھیک ہے بھئی۔'' شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔''اگر تم سب کی یہی مرضی ہے تو پھر یوں ہی سہی.....لیکن میری ایک شرط ہے؟''

''شرط......کیسی شرط ابو؟'' عدنان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''میں تمہاری دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں.....کیا پتا تمہاری بیوی واپس آئے ہی نہ اور میں..........''

''بوڑھے ہو گئے ہو مگر عقل داڑھ ابھی تک نہیں نکلی۔'' جمال نے قطع کلامی کرتے ہوئے مداخلت کی۔''بچہ پُر امید ہے اور ابا نا اُمید......یہ بعد کی باتیں ہیں، جب عدنان کی شادی کرنا ہوگی تو رشتہ میں اور عدنان کی آنٹی تلاش کریں گے......تم اپنی جاگیر سنبھالو، سمجھے تم۔''

''یہ تم میرے معاملات میں ٹانگ اڑانا کب چھوڑو گے؟'' شہزاد غصہ ہو گیا۔

''جب تک زندہ ہوں تب تک...... ہاں مر گیا تو پھر تمہیں نہیں ٹوک سکوں گا۔''

شہزاد کے دل پر اک چوٹ سی لگی۔ ''جب بھی نکالنا منہ سے بُری بات ہی نکالنا۔''

''میں اپنے مرنے کی بات کر رہا ہوں یار........''

''بکواس نہ کر۔'' اُس نے بھڑک کر قطع کلامی کی۔ ''اب اگر تم نے مرنے کی بات کی تو خدا کی قسم میں تجھے آئی سے پہلے مار ڈالوں گا۔'' اُن دونوں کی اس نوک جھونک نے عدنان اور سلیم کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔

عصر کے وقت اُنھوں نے سلیم کو رخصت کر دیا کیونکہ آفس سے اُس کی بہت زیادہ چھٹیاں ہو چکی تھیں تاہم جمال کو کسی نے جانے کی اجازت نہ دی۔ ویسے وہ خود بھی دو تین دن اُن کے ہاں رہنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

عدنان شہزاد علی ایک بار پھر وہی خواب دیکھ رہا تھا لیکن اب کی بار وہ خواب میں اکیلا نہیں تھا۔ میمونہ اور فیضان بھی اُس کے ہمراہ تھے۔ وہی چشمے کا کنارا، وہی وادی، وہی پرندے، تتلیاں، پھول اور پھل تھے۔ چاروں طرف قدرت کے حسین مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں میمونہ کا ہاتھ جب کہ دوسرے ہاتھ میں فیضان کا ہاتھ تھا۔ وہ تینوں خوشی خوشی اُس حسین و جمیل وادی کی سیر کر رہے تھے کہ معاً پھولوں کی اوٹ سے وہی حسین و جمیل اور پری پیکر عورت نمودار ہوئی اور چشمے کے پانی میں سے گزرتی ہوئی عین اُن کے مقابل پہنچ کر رک گئی۔ اُس کے چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ عدنان کو نہایت ہی پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''ماں۔'' بالکل غیر ارادی طور پر عدنان کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دونوں بغل گیر ہو چکے تھے۔ عدنان کے بعد وہ میمونہ سے گلے ملی اور پھر اُس نے فیضان کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کے چہرے پر والہانہ انداز میں بوسے دینے لگی۔ اس کے بعد ماں نے اُس سے اور میمونہ سے ڈھیروں باتیں کیں۔ اُس روز وہ بے حد خوش تھی۔ اُس نے اُنھیں وادی کی خوب سیر کرائی اور پھر اُنھیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ اُدھر ماں رخصت ہوئی اور اِدھر عدنان کی آنکھ کھل گئی۔ عین اُسی وقت قریبی مسجد میں صبح کی اذان ہونے لگی۔ عدنان اُٹھا، لائیٹ جلائی اور اٹیچڈ باتھ روم میں گھس گیا۔ جب وہ وضو کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلا تو اُس نے باپ کو منتظر پایا۔ غالباً وہ اُسے جگانے کے لیے آیا تھا۔

''گڈ'' اُسے نماز کے لیے تیار دیکھ کر شہزاد نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''آؤ چلیں۔''

یہ اُن کی روزانہ کی روٹین تھی۔ وہ صبح کی نماز قریبی مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ با جماعت نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ عدنان کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی تھی۔ با جماعت نماز ادا کرنے کے بعد جب وہ واپس پہنچے تو صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور خانساماں نے اُن کے لیے ناشتا لگا دیا تھا۔ چنانچہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔

''ابو! آج میں نے پھر امی کو خواب میں دیکھا ہے۔ اب وہ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔'' اُس نے ناشتا کرتے ہوئے بتایا۔

شہزاد مسکرایا۔ ''تو پھر کیا باتیں ہوئیں ہیں بھئی؟''

باپ کے استفسار پر اُس نے خواب کے واقعات بیان کرنا شروع کر دیے۔

''بیوی اور بیٹا ساتھ تھے مگر باپ کو بھول گئے؟'' وہ خواب سنا کر خاموش ہوا تو شہزاد نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ ''ابو جی! خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ میمونہ اور فیضان اب کہاں ہیں میرے ساتھ؟''

''ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب مجھے ہی دیکھ لو شاید میں دنیا کا بدقسمت ترین دادا ہوں جس نے ابھی تک اپنے پوتے کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ تم کم از کم اُس کی کوئی تصویر ہی لے آتے۔''

''تصویر تو ہے ابو جی۔''

''کدھر ہے؟'' اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

''میرے سیل فون میں..... میں ابھی لاتا ہوں۔'' وہ اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سیل فون لے آیا اور پھر باپ کو فیضان کی تصویریں دکھانے لگا۔ شہزاد پوتے کی ایک ایک تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کیے جا رہا تھا کہ اچانک ہی اُس کی آواز بھرا گئی اور پھر نہ چاہتے بھی اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

''ابو جی! آپ رو رہے ہیں؟'' عدنان نے کرب کے عالم میں پوچھا۔

''بہت.....بہت پیارا ہے یار تیرا بیٹا۔'' اُس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔'' اس کی آنکھیں بالکل دادی پر گئی ہیں.....کاش یہ ہمارے پاس ہوتا۔''

ایسے ہی وقت سیل فون بج اُٹھا۔''لو تمہاری کال ہے۔'' شہزاد نے فون اُس کی طرف بڑھا دیا۔عدنان نے فون لے کر جھلملاتی ہوئی اسکرین پر نظر ڈالی تو بے اختیار اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔اسکرین پر میمونہ کا نام جھلملا رہا تھا۔اُس نے کال ریسیونگ بٹن پریس کرتے ہوئے سیل فون کان سے لگا دیا۔

''عدنان! پلیز مجھے یہاں سے لے جاؤ.....ابھی فوراً۔'' اُسے میمونہ کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

''ہوا کیا ہے.......فیضان تو ٹھیک ہے ناں؟'' اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے اور رات دن تمہیں پکارتا رہتا ہے۔''

''کیا تم اپنے گھر میں ہو؟''

''ہاں.....جلدی سے آجاؤ۔''

''لل.....لیکن انکل.....وہ کیا تمہیں اجازت دیں گے؟''

''انہی کے کہنے پر تو میں تمہیں فون کر رہی ہوں اُنھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔'' میمونہ نے جواب دیا۔

''اوکے میں اور ابو ابھی آ رہے ہیں۔'' اتنا کہہ کر اُس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''ابو جی!'' وہ سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔'' آپ کی بہو اور پوتا آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ہم ابھی اُنھیں لینے جا رہے ہیں۔''

''کیا.....کیا سچ کہہ رہے ہو؟'' شہزاد نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں ابو! منصفِ اعلیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔کیس ہمارے حق میں ڈگری ہو گیا ہے۔''

''ہاں بیٹے! جو اُسے وکیل کرتا ہے وہ کبھی نہیں ہارتا۔'' شہزاد نے جواب دیا اور پھر اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔

